تنویم اور
نفسیاتی علاج



Published by
FREE AMLIYAAT BOOKS ..PDF

توہم اور نفسیاتی علاج کی تاریخ

ابتدا

علوم و فنون کی تاریخ جس قدر دلچسپ اور جاذب توجہ ہے، اسی قدر وقت طلب بھی ہے۔ فی الحقیقت کسی قدیم علم کی صحیح تاریخ کی تدوین نہ صرف دشوار ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے ایک امر محال بھی ہے۔ توہم اور نفسیاتی علاج علم طب کا ایک شعبہ ہے اور جس طرح خود طب کی تدوین کی صحیح کیفیت کا معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ اسی طرح اس کی صحیح تاریخ کا پتہ لگانا بھی دشوار ہے۔ کیونکہ اس اہم موضوع کے متعلق تاریخ میں بہت کم مواد دستیاب ہوتا ہے۔ البتہ طب کی قدیم روایات اور تاریخی شواہد سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ طب کی ابتدا نفسیاتی علاج ہی سے ہوئی ہے اور علاج معالجے کے جدید ترقی یافتہ طریقوں سے ہم جتنا پیچھے کی طرف لوٹتے ہیں اور مختلف زمانوں میں اس فن کی مختلف منزلوں پر نظر دوڑاتے ہیں تو ایک ایسے مقام تک پہنچ جاتے ہیں جس مقام سے کہ انسانی علم نے تاریخ کے دور میں اس کو پامال کیا ہے۔ تو ہمیں قریباً نہایت نظر آتی ہے۔ کہ فن طب کی ابتدا روحانی اور نفسیاتی طریقہ علاج سے ہی ہوئی ہے۔ خود لفظ طب اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ کہ اس کا ماخذ ہی روحانی رہا ہے۔ کیونکہ طب کے لفظی معنی جادو، جھاڑ پھونک کے ہیں۔ اور اس کی وجہ تسمیہ یہی تھی کہ قدیم زمانہ میں علاج معالجہ کا کام دواؤں اور آلات کے بجائے جادو اور ٹونے ٹوٹکوں سے لیا جاتا تھا۔

دور قدیم میں ازالہ امراض کے جو طریقے رائج تھے، ان کی نوعیت مختلف سرزمینوں اور قوموں میں بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور ان کے طریق عبادت، تمدن اور مذہب کو اس میں بڑا دخل ہے۔ لیکن یہ بات تقریباً سب میں مشترک ہے۔ کہ وہ اس معاملہ میں توہم پرست تھیں اور اپنے مذہب یا عقیدے کے مطابق مختلف طریقوں سے اپنے توہم کا اظہار کیا کرتی تھیں۔

اس باب میں مختلف اقوام کی تاریخی روایات کو یکجا کیا گیا ہے۔ جس سے فرداً فرداً ہر قوم اور ملک کے ابتدائی خیالات کے متعلق روشنی حاصل ہوتی ہے۔ اس سے کسی مخصوص مذہب یا قوم کا طرز علاج معلوم کرنے کے لیے ہم نے علیحدہ علیحدہ عنوان قائم کر دیئے ہیں۔ لیکن اس سے پیشتر کہ اہل بابل، مصر، بنی اسرائیل، چین، قدیم ہند، یونان، قدیم ایران، عیسائیت اور اسلام کے تاریخی طریقوں کو بیان کیا جائے۔ [illegible] مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ علم العلاج اور طب کے ان طریقوں کا اجمالی تذکرہ کر دیا جائے۔ جنہیں انسان اس وقت برتنے کا عادی تھا۔ جب تہذیب سے ابھی اس کی طبیعت آشنا نہ ہوئی تھی اور وہ غیر مہذب یا غیر متمدن کہلاتا تھا۔ اس اجمالی تذکرہ سے نہ صرف طب اور علاج کے متعلق عجیب و غریب خیالات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ موجودہ تہذیب و تمدن کے دور میں علاج و معالجے کے جو ترقی یافتہ طریقے رائج ہیں۔ ان میں بھی ان توہمات باطلہ کی نشانیاں کسی نہ کسی شکل میں تبدیل ہو کر پائی جاتی ہیں۔

امراض کی پیدائش کا قدیم تصور ——— قدیم تاریخی شواہد اور تحقیقات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نہایت قدیم ہی سے بیماری کے نظریات میں روحانی تصور کار فرما تھا۔

چنانچہ قدیم اور غیر مہذب اقوام اس سلسلہ میں عجیب و غریب عقائد کی پابند تھیں اور کسی مرض کے اسباب کی تشریح اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق شیطان، بھوت پریت اور اسی قسم کے مافوق الفطرت اشیاء کے اثر سے کیا کرتی تھیں۔ ان کے نظریات اور فلسفہ امراض حسب ذیل شکلوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

1 - کوئی مرض بیماریوں کے ان شیاطین کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جو کھلے بندوں پھرتے ہیں۔

2 - نسل انسانی کے دشمن اس کا باعث ہوتے ہیں۔ اس طرح کہ یا تو وہ انسان پر بیماری کا اثر مسلط کر دیتے ہیں۔ یا اپنی مافوق الفطرت قوت کے ذریعے اس پر قابو حاصل کر لیتے ہیں۔

3 - مردوں کی روحیں بھی سبب مرض ہوتی ہیں۔

ہم ان جانوروں کی روحیں بیماری کا سبب ہوتی ہیں۔ جو شکار میں مارے جاتے ہیں۔ قہر خداوندی کو سبب مرض قرار دینا اور یہ عقیدہ بھی کہ قربانیوں سے یہ قہر خیرات بدل جاتا ہے۔ اگرچہ ایک پرانا نظریہ ہے۔ لیکن اس کو غیر مہذب اقوام تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ بلکہ یہ تہذیب و تمدن کے اعلیٰ ادوار میں بھی پایا جاتا ہے۔ اور اس کی مثال مہذب اقوام کی زندگی میں آج بھی مل جاتی ہیں۔

امراض دور کرنے کے ابتدائی طریقے —— تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ علاج بالضد کے اصول پر انہوں نے مریض کے جسم سے شیطان کو خارج کرنے کے تین طریقے ایجاد کئے تھے۔ اور اس غرض کیلئے وہ مریض کو طرح طرح کی جسمانی تکلیفوں میں مبتلا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ یا تو مریض کو زور سے بھینچا اور نوچا جاتا تھا۔ یا اسے گھونسوں اور ڈنڈوں سے مارا جاتا تھا۔ یا اس سے فاقہ کشی کرائی جاتی تھی۔ یا اسے دھونی کے ذریعے بدبودار چیزیں سنگھائی جاتی تھیں۔ یا متلی لانے والی دوائیں دی جاتی تھیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ موجودہ زمانے میں سائنس کی تدبیر جو رائج ہے۔ وہ جسمانی تکلیفوں کی تبدیل شدہ شکل ہے۔ اور وہ تمدن کی ترقی کے باعث اب ایک مہذب اور خوبصورت شکل میں دیکھنے میں آتی ہے۔ قدیم مصریوں میں اس قسم کے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ وہ شیطان کو جسم سے خارج کرنے کیلئے مریض کو بعض مکروہ بدبو والی چیزوں کی دھونی دیا کرتے تھے۔ چنانچہ دیسی طبیبوں میں بعض امراض میں اب بھی دھونی دینے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ اور یہ اسی پرانے طریقے سے ماخوذ ہے۔ قرون وسطےٰ کے انگریزی طبیب بھی مریضوں کو دھونی دینے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ اور ان کا طریقہ بہت کچھ ان طریقوں سے ملتا جلتا تھا جو غیر متمدن اقوام کا معمول تھا۔ ایک بہت پرانی حکایت میں اس کی مثال ملتی ہے۔ کہ توبیا نے اپنی دلہن کو شیطان سے نجات دلانے کیلئے مچھلی کے دل اور جگر کی دھونی دی۔ کیونکہ اس وقت یہ عقیدہ تھا۔ کہ مچھلی کے دل اور جگر کی بو سونگھتے ہی روح مصر کے دور دراز اور بعید ترین حصوں میں بھاگ جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایڈورڈ تھیوڈور وائیمنگٹن لکھتے ہیں کہ "قرون وسطےٰ کے طبیب جس طرح پر علاج کیا کرتے تھے۔ ان میں اس رسم کی جھلک نظر آتی ہے۔ کیونکہ وہ بھی اسی قسم کی دوائیں تجویز کیا کرتے تھے۔ جو مچھلی کے جگر اور دل کا سا اثر پیدا کریں۔"

شیطان کو رفع کرنے کیلئے ایک اور طریقہ بھی مروج تھا۔ اس میں اس سے یہ عہد لیا جاتا تھا۔ کہ وہ کسی خاص جون یا حالت میں تبدیل ہو جائے گا۔ چنانچہ آریوں کے ویدوں میں ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یرقان کے شیطان سے یہ التجا کی جاتی تھی۔ کہ وہ کسی زرد چڑیا میں حلول کر جائے اور اسی طرح بیماری کی زردی سے [illegible] کی جاتی تھی۔ کہ وہ مینڈک کے اندر چلی جائے۔

شیاطین کو خارج کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی رائج تھا۔ کہ وہ اشخاص جو بیماریوں کی روحوں پر قدرت رکھتے تھے۔ منتروں اور عملیات کے ذریعے انہیں مریض کے جسم سے خارج کر دیا کرتے تھے۔

جیسا کہ اوپر ظاہر کیا جا چکا ہے۔ کہ امراض کی پیدائش کے متعلق ایک دستور یہ تھا۔ کہ وہ ان جانوروں کی روحوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ جو شکار میں مارے جاتے ہیں۔ اس خیال کے تحت یہ سمجھا جاتا تھا۔ کہ اس قسم کے جانوروں کی روحیں اس وقت اپنا بدلہ لیا کرتی ہیں۔ جب شکاری کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ بچہ کی پیدائش کے موقع پر وہ ماں اور بچہ کو اپنا شکار بناتی ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں ہستیاں امراض اور بُری روحوں کے اثر کو قبول کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں یہ ایک عام دستور تھا۔ کہ جب کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تھا۔ تو مرد صید و شکار سے باز رہتا تھا۔ مبادا کہیں جانوروں کی روح اس کی بیوی اور بچہ کو نقصان پہنچائے۔ یہ دستور اب بھی بعض وحشی اقوام میں پایا جاتا ہے۔ اور وہ ایسے موقع پر اس کی پابندی ضرور کرتی ہیں۔ غرض یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے۔ کہ امراض کے ساتھ ہی سحر اور خبیث ارواح کے تخیل نے جنم لیا۔ اور اسی کے ساتھ ایسے طریقے اختراع پذیر ہوئے جنہیں روحانی یا نفسیاتی علاج کا آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ مشرقی [illegible] کی قدیم [illegible] سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ آج سے بارہ ہزار سال قبل کے لوگ شکار تک میں سحر کے پابند تھے۔ جہاں تک مرض کے اندر سحر [illegible] مرض کے ظہور اور علاج کی کیفیت اس کی نسبت واضح ہے۔ ڈاکٹر البانی نے اس کی تصریح کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔ کہ "قدیم زمانہ میں مرض اور زخم کو سحر کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ اس لئے ارباب مذہب سے جھاڑ پھونک کرائی جاتی تھی۔" ابتدائی زمانہ میں ایک تصور یہ بھی تھا کہ حکمرانوں اور بادشاہوں کو فوق العادہ قوی حاصل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے شاہی لمس کو بھی مفید سمجھا جاتا تھا۔

ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں تحریر کیا ہے کہ "بعض اصحاب طب کی ابتدا مصر اور بابل کے ساحروں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کیونکہ ابتدا میں مریض [illegible] سحر [illegible] کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔"

وحشی اقوام کا فلسفہ مرض —— [illegible] یہ ایک دلچسپ بات ہے [illegible] تہذیب و تمدن سے عاری ہیں اور دنیا سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے [illegible] متاثر ہوئے ہیں۔ [illegible]

آسٹریلیا اور بحر الکاہل کے بعض جزائر کے اصلی باشندوں کا اب بھی یہ خیال ہے۔ کہ ایک ساحر جادو سے مرض یا زخم پیدا کر دیتا ہے۔ وہاں کے عقیدہ کے مطابق امراض یا تو خدائی قوانین کی خلاف ورزی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں یا جادو سے۔ جب جادو سے مرض پیدا کیا جاتا ہے۔ تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دشمن عموماً کچھ فاصلہ سے ایک نوکیلی لکڑی یا ہڈی سے اشارہ کرتا ہے۔ جس سے مرض کا پیدا ہونا یقینی سمجھا جاتا ہے۔ اس مرض کو دور کرنے کیلئے وہاں کے معالج کے پاس ایک شیشہ ہوتا ہے۔ جسے وہ مریض کے جسم پر لگاتا ہے۔ تو دائم اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا ہے۔ اکثر معالج مریض کے جسم سے چمٹ جاتا ہے۔ اس کی مالش کرتا ہے اور اس کے جسم سے زہر چوستا ہے۔ ان تمام اعمال سے مریض کو یقین ہو جاتا ہے۔ کہ اس کا مرض زائل ہو رہا ہے۔ عجیب امر یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے روحانی معالج، مرض دور کرنے سے انکار کر دے تو مریض اپنی زندگی سے مایوس ہو کر موت کی گھڑیاں گننے لگتا ہے۔

بھوت پریت ——— ہندوستان، انڈونیشیا، ملایا، برما، سیام، فجی، مڈغاسکر، وسطی افریقہ اور امریکہ وغیرہ کی بعض اقوام میں اب بھی پیدائشی مرض کا سبب بھوت پریت، ارواح خبیثہ، جنوں یا دیوتاؤں کی ناراضگی کو قرار دیا جاتا ہے۔ اور ان کی مفروضہ ناراضگی کو دور کرنے کیلئے مختلف اقوام میں مختلف رسوم و اعمال مروج ہیں۔

سحر ——— بعض مقامات بالخصوص آسٹریلیا، جزائر غرب الہند اور وسطی افریقہ میں بعض وحشی قومیں جادو کو پیدائشی امراض کا سبب قرار دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک ساحر اور جادوگر ان اشخاص پر جنہیں وہ تکلیف کا شکار بنانا چاہتے ہیں۔ نہ صرف براہ راست جادو کے الفاظ پڑھ کر پھونکتے ہیں اور بری نظر کا شکار کر لیتے ہیں۔ بلکہ ان کے ناخنوں اور بالوں وغیرہ پر بھی جادو کر کے انہیں مبتلائے امراض و آلام کر سکتے ہیں۔ یہ خیال ہندوستان کے بعض قدیم ہندو فرقوں اور صوبجات متوسط و دکن وغیرہ میں کسی قدر مختلف صورت میں اب بھی پایا جاتا ہے۔ اور دیہات کے علاوہ شہروں میں بھی کم و بیش موجود ہے۔ کچھ عرصہ ہوا قلوب کی وساطت سے یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی تھی کہ ہندوستان کے اکثر حصوں میں لوگ اب تک جادو پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے۔ جو ضلع پٹنہ کے ایک شہر میں ہوا ہے۔ یہاں ایک پچپن سالہ بوڑھی عورت کو اس علاقہ کے لوگوں نے کوئی سبب بتائے بغیر ہلاک کر دیا۔ یہ عورت کئی سال سے جادوگری کیلئے بدنام تھی۔ اور بہت سے بچوں کی موت کی ذمہ دار گردانی جاتی تھی۔ لوگوں نے یکایک مشتعل ہو کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اس کی وجہ ایک نو سالہ لڑکی کی اچانک موت تھی جس کی ذمہ دار گردانی گئی۔

دکن کا کالا جادو ——— ایک انگریز مصنف ڈبلیو۔ لاؤاچی نے اسٹرینڈ میگزین میں دکن کے کالے جادو کے متعلق تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ یہاں اس کی تلخیص پر اکتفا کیا جاتا ہے:-

"بھانامتی کا واقعہ، سرزمین دکن سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس حیرت انگیز جادو کے واقعات نہ صرف عوام ہی میں قابل یقین سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ حکومت کی طرف سے اس کی تحقیقات کرنے والے افسروں کی رپورٹوں میں بھی اس کی صداقت کا اعتراف کیا گیا ہے چنانچہ پولیس کے ایک بڑے انگریز افسر مسٹر ایل۔ بی۔ گوڈ آئی۔ پی۔ ایس جو اس جادو کی تحقیقات کے کام پر مامور کئے گئے تھے۔ اپنی رپورٹ میں بیان کرتے ہیں۔ کہ جو شخص اس جادو کو سیکھنا ہے۔ اسے اس کا عامل بننے کیلئے بعض رکیک اور بیہودہ حرکات کرنی پڑتی ہیں۔ جنہیں کوئی خوددار انسان گوارا نہیں کر سکتا۔ جب یہ جادو سیکھ لیا جاتا ہے۔ اور انسان اس کا عامل بن جاتا ہے تو وہ چمڑے، آٹے، ہڈی یا لکڑی کا پتلا بنا کر اس کے سامنے کچھ منتر پڑھتا ہے۔ اور کئی راتوں تک یہ سلسلہ جاری رکھنے کے بعد جس شخص کو تکلیف دینا چاہتا ہے۔ اس کا اور اس کے والدین کا نام لے کر کچھ خاص خاص اعمال پڑھتا ہے۔ اس سے یہ ہوتا ہے۔ کہ کبھی تو معتوب کے کپڑوں یا بستروں میں آگ لگ جاتی ہے کبھی اس کے سامنے رکھا ہوا کھانا گندگی میں بدل جاتا ہے۔ کبھی نامعلوم مقام سے اس کے گھر پر پتھر گرنے لگتے ہیں۔ یا اس کے جسم میں سوئیاں چبھنے لگتی ہیں۔ یہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس جادو کا عامل ہر جستہ طریقے سے ہر وقت اپنی قوت کو استعمال میں نہیں لا سکتا۔ بلکہ جب کسی کو نشانہ ستم بنانا چاہتا ہے۔ تو اسے ہر بار وہی پورا عمل دہرانا پڑتا ہے۔ یعنی پتلا بنا کر اس کے آگے مختلف منتر اور افسوں پڑھنا اور بعض پراسرار اعمال کرنا وغیرہ۔ چنانچہ اس قسم کے جادوگروں یا عاملوں کو جب بھی پولیس نے اچانک گرفتار کر لیا۔ تو وہ بے بس پائے گئے۔ اور ان کی قوتیں غیر مؤثر ہو گئیں۔

"اسی سلسلہ میں ... گورنمنٹ ... نے ایک اقتباس دیا ہے۔ جس میں انہوں نے یہ بتایا ہے۔ کہ دکن کے جادو اور ساحل مالابار کے جادو میں بہت کچھ مشابہت ہے ... عاملوں اور جادوگروں میں ... پوشیدہ ہوتی ہے۔ کہ ...

نظروں سے غائب ہو جائیں۔ یا جس جانور کی شکل چاہیں اختیار کر لیں۔

آگے چل کر تھیوڈ ڈبلیو لا چی نے لمنیلنا ایک وکیل مسٹر منانی کا واقعہ مسٹر گوڈ کے حوالہ سے پیش کیا ہے۔ جسمیں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے ایک شخص مسمی خاندوجی کے مقدمہ کی پیروی کی تھی۔ جس نے ایک شخص بالوجی اور اس کے بیٹوں پر استغاثہ دائر کیا تھا۔ پہلے تو بالوجی نے وکیل کو دھمکیاں دیں کہ وہ اس مقدمہ کی پیروی سے باز آئیں۔ لیکن جب انہوں نے اس کی دھمکیوں کی پرواہ نہ کی تو بالوجی نے ان پر بھانا ماتی کا جادو کر دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جب مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی تو وکیل صاحب جرح کیلئے کھڑے ہوئے۔ تو انہوں نے اپنے آپ کو خالی کٹہرہ پر سوالات کرتے ہوئے پایا۔ اور انہیں کسی صورت سے بھی جج کی موجودگی کا یقین نہ آیا۔ پھر جب وہ گھر پہنچے تو ان کی آنکھ نہ لگ سکی۔ کئی بار انہیں سانپ کا ایک سایہ نظر آیا۔ جو مدہم روشنی میں ان کے کمرے کی دیوار پر رینگ رہا تھا۔ لیکن جب وہ تلاش کر کے دیکھتے تھے۔ تو وہاں سانپ کا وجود نہ پاتے تھے۔

دوسرے روز صبح کو ایک عجیب بات ہوئی۔ ان کی ناک سیاہ ہو گئی اور کچھ عرصہ کے بعد ایسے نشانات کندھوں گردن اور جسم کے دوسرے حصوں پر بھی ہو گئے۔ جو سانپوں اور دوسرے حیوانات سے مشابہ تھے۔

مسٹر گوڈ نے اپنی تحقیقات کے دوران میں اپنے پڑھے لکھے لوگوں سے اس بارے میں تبادلہ خیالات کیا۔ لیکن سب کو اس جادو کا معترف پایا۔ چنانچہ انہوں نے اسی سلسلہ میں کونسل کے ایک رکن سے بھی بات چیت کی۔ جنہوں نے آپ بیتی سنائی اور بتایا کہ ان کے گھر کے مختلف حصوں میں پراسرار طور پر آگ لگ جاتی تھی۔ اور کبھی کمروں میں پتھر آ کر گرتے تھے۔

"کہا جاتا ہے کہ بھانا ماتی کی ایجاد کا سہرا رشی گورکھ ناتھ کے سر ہے۔ چنانچہ بھانا ماتی، کی پوجا کے وقت جو منتر جنتر پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں اس کا بار بار نام لیا جاتا ہے۔"

غرض سحر اور جادو کی داستانیں مہذب قوموں میں بھی ملتی ہیں۔ اور ان کی توجیہ محال ہے۔

ارواح خبیثہ ——— سر جیمز نے اپنی مختلف تحریروں اور تصانیف بالخصوص تمدن قدیم (پریمی ٹو کلچر Primitive Culture) میں تصریح کی ہے۔ کہ سماٹرا، جاوا، ملایا، مڈغاسکر اور ہندوستان کے اکثر اضلاع کی بعض قدیم اور جاہل اقوام ایسی ہیں۔ جو مردہ اشخاص کی خبیث روحوں کو بیماریوں اور امراض کا باعث قرار دیتی ہیں۔ کم و بیش اسلاف کے سے [illegible] ان کا یہ خیال ہے۔ کہ جو شخص زندگی میں کسی کا دشمن یا مخالف ہوتا ہے۔ وہ مرنے کے بعد بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور اس کی روح اپنے دشمن کے جسم میں حلول کر کے یا کسی واسطہ سے اس کو مبتلا امراض کر دیتی ہے۔ مرگی، اختناق الرحم، جنون، تشنج اور عصبی امراض کے متعلق یہ نظریہ دنیا کے قریب قریب تمام حصوں میں کمزور اعتقاد کے جاہل لوگوں میں کم و بیش موجود ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار شاہد ہیں کہ اکثر زمانوں میں مرض اور علاج میں سحر اور جادو کو بہت کچھ دخل رہا ہے۔ خود یورپ کے قرون مظلمہ میں سحر پرستی اور توہم پذیری زوروں پر تھی۔

جادو کے ذریعے جو مرض پیدا کیا جاتا ہے اس کا تصور کس مقصد کے پیش نظر رائج ہوا۔ اور اس کی توجیہ کس طرح کی جاتی ہے۔ یہ ذیل کی سطور سے معلوم ہو گا۔

جادو کے طریقے ——— عام طور سے جادوگر دو طرح جادو کرتا ہے (۱) یہ فرض کر کے کہ علت اور معلول میں کافی مشابہت ہوتی ہے۔ یعنی کسی عمل کی نقل سے اصل ظہور پذیر ہوتا ہے۔ مثلاً کسی پتلے کی ٹانگ یا ہاتھ توڑنے سے دشمن کا وہی عضو توڑا جا سکتا ہے۔ گویا اشیا کی مشابہت کے ہمراہ ان کی اصلیت بھی مشترکہ سمجھی جاتی ہے۔ اس قسم کے جادو کو تقلیدی جادو سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ (۲) یہ خیال کر کے کہ وہ چیزیں جن کا آپس میں کبھی تعلق رہا ہو۔ دائمی طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہوتی ہیں۔ جو عمل کسی مادی چیز مثلاً بال، ناخن وغیرہ پر کیا جائیگا۔ وہ عملی صورت میں جس شخص کی وہ چیز ہو گی۔ اس پر اثر انداز ہو گا۔ اسے متعدی جادو کہہ سکتے ہیں۔

تقلیدی جادو ——— تقریباً ہر زمانے اور ہر ملک میں موجود تھا۔ اور یہ آج بھی ہندوستان، ملایا، سیام، آسٹریلیا، امریکہ، افریقہ [illegible] بلکہ ہر جگہ رائج ہے۔ ہندوستان میں کسی دشمن کا پتلا بنا کر اس میں سوئیاں وغیرہ چبھو دی جاتی ہیں۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ [illegible] دشمن سے بدلہ لینے کیلئے اس کا موم کا پتلا بنا کر اس کی راہ میں جلا دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس طرح دشمن کی روح جل جاتی ہے۔ [illegible] کسی کی تصویر بنا کر اس میں جس جگہ چاقو گھونپ

دیا جائے۔ اس شخص کو اس مقام پر زخم ہو جائیگا۔ اس عمل کے اثر کو زیادہ اور یقینی طور پر مؤثر بنانے کیلئے اس کے ساتھ ہی جنتر منتر یا خاص اعمال بھی شامل ہوتے ہیں۔

متعدی جادو۔ ایسے عام طور پر بالوں، ناخنوں اور دانتوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں دشمن کو اذیت دینے کیلئے اس کے سر کے بالوں کو جلا دیا جاتا ہے۔ اور خیال کیا جاتا ہے۔ چونکہ بالوں کا تعلق اس کے جسم سے رہ چکا ہے۔ اس لئے اس کے سر میں درد ہوگا۔ اسی وجہ سے نیو سائوتھ ویلز کے باشندے دانتوں کو نکال کر بے احتیاطی سے انہیں پھینکا نہیں کرتے بلکہ بڑی حفاظت سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ مبادا وہ دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ ایک ڈاکٹر اس جگہ کے ایک شخص کا دانت نکال کر اپنے ساتھ لے گیا۔ ایک سال بعد وہ شخص اچانک بیمار ہو گیا۔ اسے خیال ہوا کہ اس کا دانت کسی دشمن کے پاس پہنچ چکا ہے۔ اس کے قبیلے کا سردار اڑھائی سو میل پیدل سفر کر کے ڈاکٹر کے پاس دانت واپس لینے آیا۔ تاکہ مریض کا وہم دور کر سکے۔

ساحر کا احاطہ خیال ——— ساحر کو یقین ہوتا ہے کہ وہ اپنے اعمال سے ہر چیز کو متاثر اور تمام امراض کو دور کر سکتا ہے۔ جن اصولوں پر جادو کا دارومدار ہوتا ہے۔ وہ انہیں تجربہ کی کسوٹی پر پرکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس کے پاس دلائل و براہین بھی نہیں ہیں۔ وہ تو بس جو کچھ دیکھتا بلکہ محسوس کرتا ہے۔ اس پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ وہ خود کو انسان برتر سمجھتا ہے۔ اپنے خیالات کو تمام دنیا پر فوقیت دیتا ہے ایسے اپنی ذات ساری کائنات پر احاطہ کئے ہوئے معلوم ہوتی ہے۔ کسی کو سد راہ دیکھنا اسے گوارہ نہیں ہوتا۔ اس کے خیالات کی بلند پروازی اسے مظاہر قدرت کو قابو کرنے کیلئے مجبور کرتی ہے۔ آندھی، طوفان اور بارش سے تباہی دیکھ کر وہ انہیں اپنے بس میں کرنا چاہتا ہے۔ صرف جاندار ہی نہیں۔ بلکہ وہ بے جان اشیا کو بھی زیر نگیں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کیلئے ہر کام کر گزرتا ہے۔ جادو اور منتر کے ہمراہ جڑی بوٹی اور کیمیائی اعمال کا جائزہ لیتا ہے۔ اس کی انا نیت اس کے سمند شوق پر تازیانہ کا کام دیتی ہے۔ اور وہ اپنے اعجب العجائب اور اغرب الغرائب تجارب میں اور زیادہ منہمک ہو جاتا ہے۔ انفرادی جادو ہر شخص ذاتی اغراض مثلاً اپنی یا اپنے عزیز و اقارب کی حفاظت اور دشمنوں کو نقصان پہنچانے کیلئے کرتا ہے۔ جب ساحر اجتماعی جادو کرتا ہے تو وہ جیسے حکومت کا اہم حصہ بن جاتا ہے۔ یہ جادو فرد واحد کی بہبودی کیلئے نہیں۔ بلکہ سماج (سوسائٹی) کی بہتری کیلئے کرتا ہے۔ اور صاحب قوت بن جاتا ہے۔ اجتماعی جادو سے سماج کی باگ ڈور نسبتاً زیرک اور دانا اشخاص کے ہاتھوں میں آ جاتی ہے۔ یہ امر تہذیب کے ارتقا کیلئے کم ضروری نہیں ہے۔

دوا کی ابتدا ——— اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے۔ کہ جیسے جیسے تمدن ترقی کرتا گیا۔ مرض کے تصورات میں بھی مختلف تبدیلیاں ہوتی گئیں اور توہم پرستی کے مقابلہ میں حقیقت بینی جگہ حاصل کرتی رہی۔ چنانچہ امراض کے متعلق جادو اور توہمات کا سلسلہ جاری رہنے کے باوجود ادویہ کا کم و بیش استعمال شروع ہو گیا۔ جو مرور ایام کے ساتھ ترقی کرتا گیا۔ اس غرض کیلئے بہتر ہوگا۔ کہ ہم ان اقوام کے حالات کا مطالعہ کریں۔ جو ابھی تہذیب کے ابتدائی مدارج طے کر رہی ہیں۔ ہندوستان کے بھیل اور گونڈ اور آسٹریلیا کے اصلی باشندے بعض سادہ دوائیں استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ریوار نے تحریر کیا ہے۔ کہ شمال مشرقی نیوگنی میں معالج جادو کا ماہر ہونے کے علاوہ سادہ پٹیاں، فصد، جونک اور بخاری غسل کا استعمال کراتے ہیں۔ آسٹریلیا کے اصلی باشندے معالجات میں جادو، منتر اور تعویذ کے علاوہ خون، سانپ کی چربی اور مختلف جڑی بوٹیاں برتتے ہیں۔

بابل اور نینوا

اکثر علمائے تاریخ کا خیال ہے۔ کہ انسانی وجود کا ظہور سب سے پہلے جنوب مغربی ایشیا میں ہوا۔ بابل اور نینوا اولین علاقے تھے۔ جہاں تہذیب نے باقاعدہ طور پر پرورش پائی۔ پنسلوینیا یونیورسٹی اور برطانوی عجائب خانہ (برٹش میوزیم) کی مشترکہ مہم اور ڈاکٹر لینگڈن، ڈاکٹر میسو بونز، ڈاکٹر کیمبل تھامس اور لیونارڈ وولی کے انکشافات سے اس نظریہ کو اور بھی تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ بابل اور نینوا کی تہذیبیں اس طرح آپس میں ملی ہوئی ہیں کہ ان کے درمیان کسی طرح کی حد فاصل قائم نہیں کی جا سکتی۔ فی الحقیقت یہ ایک ہی سرزمین کے دو حصے ہیں۔ جن کی معاشرت، تہذیب، تمدن اور مذہب وغیرہ میں بڑی حد تک مماثلت ہے۔

بابل میں علم العلاج کی ابتدا ——— تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے۔ کہ سب سے پہلے طب کی ابتدا، بابل اور نینوا میں ۵۰۰۰ ق م سے بھی پہلے ہوئی۔ [illegible] نینوا، اشور وغیرہ کے شاہی کتب خانوں میں دس

سے بارہ ہزار تک جو تختیاں کتبے دستیاب ہوئے ہیں۔ اور اس وقت سے برطانوی عجائب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ان میں ۶۶۰ طب کے متعلق ہیں جن کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ابتدا میں علاج صرف جھاڑ پھونک، گنڈے تعویذ اور مذہبی اعمال پر مشتمل ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے ساتھ یہ رواج ہو گیا کہ مریض کو چوراہے پر لٹا دیا جاتا۔ جہاں ہر ایک راہرو سے علاج پوچھتا۔ اگر کسی کو کوئی علاج معلوم ہوتا۔ تو وہ اسے بتا دیتا۔ جو علاج یا دوا زیادہ مؤثر ہوتی۔ اُسے تانبے یا چاندی کی تختی پر لکھ کر رب الشفا (طبی دیوتا) کے بُت کے گلے میں لٹکا دیتے تھے۔ اسطرح ادویہ کا استعمال شروع ہو گیا۔ اور طب کی ترقی کے ساتھ بڑھتا گیا۔ جب بابل کی تہذیب اوج پر پہنچی تو طب بھی اس کے شایان شان تھی مختلف شہروں میں طبی درسگاہیں بن گئیں۔ جو عقلی طب کی تعلیم دیتی تھیں۔ آسینیہ میں ایک ایسا ہی طبی مدرسہ تھا۔ جہاں کے اساتذہ نباتی اور جمادی ادویہ کی بھی بخوبی تعلیم دیتے تھے۔

بہت سے کتبے مختلف امراض کے علاج اور ان کے نسخوں کے متعلق ہیں۔ کہیں کہیں نسخوں کے آخر میں وہ جادو اور منتر بھی درج ہیں۔ جو مرض کے "شیطان" کو دفع کرنے کیلئے معمول تھے۔ نسخوں میں ٹکیوں، پھنکیوں، پلستروں، سنیاتوں، تدہینوں، مکوروں، مرہموں، طلاؤں اور حقنوں وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ سر، آنکھ، ناک، کان، دانت، عضلات، زہر، پھوڑوں اور زخموں کا تذکرہ ہے۔ وہ ۲۰۰۰ ق م سے بھی پہلے سانپ اور بچھو کے کاٹنے کا علاج جانتے تھے۔ لیوری دائرمین نے اسیریائی سلطنت کی خط و کتابت کا جو ترجمہ ۱۹۳۰ء میں شائع کیا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اس وقت تشخیص، علامات اور علاج پر کسی قدر توجہ صرف کی جاتی تھی۔ اس وقت کے مشہور طبیب اراد نانا نے جو خطوط شاہ وقت ایسر ہدن (برادر آشور بنی پال) کو لکھے تھے۔ ان سے یہ حقیقت واضح طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔

سحر اور اوہام کا دخل ——— ان کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بابلی تمام آلام و امراض کو شیاطین یا قوانین الٰہی کی خلاف ورزی کے نتائج میں دیوتاؤں کی ناراضگی قرار دیتے تھے۔ درد، بخار اور زخم وغیرہ شیاطین سے منسوب کئے جاتے تھے۔ کسی شخص کی بیماری اس امر کی دلیل تھی کہ اس کے جسم میں شیطان حلول کر گیا ہے۔ اس وقت کا ہن (پیشوا) ہی طبیب ہوا کرتے تھے۔ وہ علاج اس لئے کرتے کہ شیطان کو نکال دیں۔ اس غرض کیلئے پرانے منتر تھے جو ان میں ہزاروں سال تک مروج رہے۔ بالعموم ماردوک دیوتا (رب النار - آگ دیوتا) کی مدح و ثنا کے بعد اس سے التجا کی جاتی کہ وہ اس دکھ کو دور کر دے۔ ان کا عقیدہ تھا۔ کہ منتروں سے نہ صرف مریض کے جسم سے شیطان کو نکال کر مرض کو دور کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ ان کو حاضر کر کے تندرست شخص کے جسم میں داخل کر کے اُسے بیمار بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا۔ کہ منتروں کی بے پناہ قوت کے سامنے شیطان لاچار محض ہو جاتا ہے۔ انہیں یقین تھا۔ کہ ساحر امراض پیدا کر سکتا ہے۔ ہری بھری فصل کو تباہ کر سکتا ہے۔ بارش، اولے، آندھی اور طوفان پیدا کر سکتا ہے۔ منتر پڑھ کر یا کسی چیز پر منتر پھونک کر اور اسے کھلا کر جسے چاہے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ ساحر کو فوق الفطرت قوتوں کا حامل سمجھتے اور اس سے خوف کھاتے تھے۔

علاج کے طریقے — مریض کے علاج کیلئے کاہن اس کے سرہانے کھڑا ہو کر منتر پڑھتا اور شیطان کو مریض کے جسم سے نکل جانے کا حکم دیتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اگرچہ دوائیں بھی استعمال کی جاتی تھیں۔ مگر ان کا استعمال بھی اسی خیال کے تحت کیا جاتا تھا۔ کہ دوائیں بھی مریض کے جسم سے شیطان کو نکال دیتی ہیں۔ لیکن منتر بہر حال لازمی ہوتے تھے۔ ایک خاص عمل یہ تھا۔ کہ کسی دیوتا کو مکان کا محافظ قرار دیا جاتا۔ کہ وہ اس کے مکینوں کی حفاظت کرے اور آفات و بلیات کو دور کرے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین نے کھدائی سے شاہ سارگن کا جو محل برآمد کیا ہے۔ اُس کے ایک دروازے پر دونوں طرف محافظ فرشتے بنے ہوئے ہیں۔ ان کا جسم پیدائشی کا لیکن سر انسان کا ہے۔

مصر قدیم

قدیم مصر میں جب ہم ازالہ امراض اور علاج کے طریقوں کے متعلق تحقیق کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں طب نے بہت ترقی کی۔ لیکن بابل اور نینوا کی طرح یہاں بھی طبیب مذہبی پیشوا ہوا کرتے تھے۔ مذہبی پیشواؤں کے ان ہر دو فرائض کے درمیان کسی قسم کی حد بندی ممکن نہیں۔ تاہم جو اطوار کے فرائض، منصب صرف جیر پجانتک محدود تھے۔ طبیب بہت زیادہ قدر و منزلت سے دیکھا جاتا تھا۔ مثلاً کہ مصر کا قدیم ترین طبیب امحوطب (موسی صوو ادوار) جو مصر کے بادشاہ زوسر کا وزیر اعظم اور معمار خاص بھی تھا۔ اسی طرح دیوتا تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس طرح یونانی طب میں اسقلیبوس کو عزت اور اس کا بھی رب الشفا خیال کرتے تھے۔ وہ مریضوں کو نکہ رستگاری

بخشتا تھا۔ دیگر تمام علوم کے علاوہ اُسے سحر میں بھی بڑی طولیٰ حاصل تھی۔ مصر کے اکثر شہروں میں اُس کے مندر بنے ہوئے تھے۔ جہاں اُس کے مجسموں کی پوجا کی جاتی تھی۔ ان میں سب سے بڑا شہر منفس کا مندر تھا۔ جہاں کے پجاری علاج معالجہ میں بھی امتیاز خاص رکھتے تھے۔ اِس مندر میں ہزاروں مریض علاج کیلئے آتے تھے۔ جن کا علاج جھاڑ پھونک، منتر جنتر اور دواؤں غرض سبھی طرح کیا جاتا تھا۔

امحوتب کے بعد پانچویں بادشاہی کے فرعونی طبیب سیخمت (Sekhmet) اور را اَور (Raw Aur) مشہور طبیب گزرے ہیں۔

مصر کے قدیم دبے ہوئے شہروں اور مقبروں کی کھدائی سے جو ممیاں (محفوظ کی ہوئی لاشیں) کتبے، تحریریں، نوشتے اور دیگر بے شمار اشیا دستیاب ہوئی ہیں۔ اُن سے اس عہد کے مصر کی مذہبیت، معاشرت، عمرانیت، تہذیب، علم و ادب اور طب وغیرہ پر معتدبہ روشنی پڑتی ہے۔

مصریوں کے نوشتے ——— نوشتے ایک درخت کے پتوں سے تیار کئے ہوتے کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں۔ اور ۱۸۶۲ء میں اور اس کے بعد دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں یہ چار سب سے اہم ہیں (۱) ایبرز پیپرس ۱۵۰۰ ق م (۲) ایڈون سمتھ پیپرس ۱۶۰۰ ق م (۳) ہرسٹ پیپرس ۱۴۰۰ — ۵۰۰ ق م (۴) برلن پیپرس ۱۲۹۰ — ۱۲۳۰ ق م۔ پھر ان میں اول الذکر دو زیادہ مشہور اور نہایت اہم ہیں۔ جن کے جزوی تراجم المانوی اور انگریزی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ایبرز پیپرس ۱۵۰۰ ق م کا ایک مکمل طبی نوشتہ ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ اس سے بھی کئی صدی پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ یہ نوشتہ پروفیسر جارج ایبرز کو ۱۸۷۲ء میں مصر کے ایک مقبرے کی کھدائی سے دستیاب ہوا تھا۔ ۱۸۷۵ء میں انہوں نے اس کا ترجمہ اصل کے ہمراہ شائع کر دیا۔ اب یہ لیپزگ یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس نوشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۰۰۰ ب ق م میں شاہ آتھوتس نے طب پر ایک کتاب تحریر کی تھی۔ یہ نوشتہ مختلف امراض کے نسخوں سے بھرا پڑا ہے۔ امراض کے علیحدہ علیحدہ نام اور تجویز دوائیں معہ مقدار خوراک جن کے ساتھ اکثر ترکیب استعمال بھی ہے تحریر کی گئی ہیں۔ کہیں کہیں امراض کی تشخیص اور تشریح بھی درج ہے۔ دواؤں کے پہلو بہ پہلو اس میں جادو اور جنتر منتر بھی درج کئے گئے ہیں۔ جو ادویہ امراض کو دور کرنے کیلئے مناسب ہیں۔ انہیں بھی جادو کے آلہ کار کی حیثیت ہوتی تھی۔ اور استعمال سے قبل ان پر منتر کیا جاتا تھا۔ اس نوشتہ میں ایک نسخے کے متعلق تحریر ہے کہ وہ بدن سے جادو کا اثر زائل کرتا ہے۔ آگ وغیرہ سے جلنے کے متعلق مصریوں کا عقیدہ تھا۔ کہ وہ دیوتاؤں کے غضب یا بھوت پریت کی شرانگیزی کا نتیجہ ہوتی۔ ایبرز پیپرس میں اس کے متعلق یہ دو منتر ہیں۔ جو مریض کے جل جانے پر اُس کی تسلی کیلئے سنائے جاتے تھے۔ بعل ایسس دیوی کیلئے اپنے بیٹے ہورس کے پاس آئی۔ جب وہ آگ سے جل گیا تھا۔ جیسے وہ اُس کے پاس آئی ویسے میرے پاس آئیگی۔"

طبی نوشتوں کے تراجم سے پتہ چلتا ہے۔ کہ قدیم الایام میں مصری نہ صرف طب میں کافی ترقی کر چکے تھے۔ بلکہ جراحی میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ ایڈون سمتھ پیپرس زیادہ تر جراحی امراض اور ان کے علاج پر ہیں۔

سحر اور طب کا امتزاج ——— مصریوں کا خیال تھا۔ کہ مرض اور موت لاعلاج ہیں۔ زندگی کی صبح شروع ہونے کے بعد اُس کی شام نہیں ہونی چاہیئے۔ تاوقتیکہ کوئی شدید حادثہ پیش نہ آجائے۔ کوئی شخص اپنی موت نہیں مرتا۔ بلکہ کوئی اور فرد یا شئے اس کی موت کا باعث ہوتی ہے۔ ان کا عقیدہ تھا۔ کہ امراض کا باعث خبیث ارواح ہیں۔ جو جسم میں داخل ہو جاتی ہیں۔ انہیں جسم سے باہر نکالنے کیلئے سارے جتن کئے جاتے تھے۔ جس میں دواؤں کا استعمال بھی شامل تھا۔ صرف جلنے یا زخم وغیرہ کی صورت میں جب کہ تکلیف کی وجہ صاف طور پر نظر آتی تھی۔ ارواح خبیثہ سے نسبت نہ دی جاتی اور دواؤں پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس جب امراض کے اسباب کا پتہ نہ چلتا۔ تو صرف سحر سے کام لیا جاتا اور ارواح خبیثہ کو جسم سے دفع کرنے کیلئے جنتر منتر پڑھ کر پھونکے جاتے۔ ان چند صورتوں کے علاوہ سحر اور طب لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور ان کا استعمال ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا طبی نوشتہ ہوگا۔ جس میں تعاویذ اور منتر درج نہ ہوں اور سحر کا مشکل کوئی نوشتہ ہوگا۔ جس میں نسخے نہ ملیں۔ ان نوشتوں میں نسخوں کی تعریف اور غرض وغایت یہ بتائے کی بجائے کہ ان سے امراض کا استیصال ہوتا ہے۔ یہ تحریر کیا گیا ہے۔ کہ یہ امراض کو ڈراتے یا بھگاتے ہیں۔ بابل کی تقلید میں ارواح خبیثہ کو تکلیف پہنچانے والی اشیا اور دوائیں مثلاً گوبر اور بدبودار دھونیاں اور نہایت بدمزہ دوائیں تجویز کی جاتی تھیں۔ بعد میں ان کا استعمال نسبتاً کم ہو گیا تھا۔

نفسیاتی علاج ——— تقریباً ۴۰۰۰ ق م میں جب مصر کی تہذیب کو عروج حاصل تھا اور فرعون تور وس تھا اُس نے دیوتا کا ایک مندر بنایا تھا۔ جہاں مذہبی پیشوا دعائیں، منتروں اور مذہبی اعمال وغیرہ سے مریضوں کا علاج کیا کرتے تھے۔ مریض دیوتا کے بت کے سامنے سر جھکا کر بیٹھ جاتا ... ان کو مسلسل ترغیب دیتا ... کاہن اور سر کو جھکا کر اپنے دل پر ہاتھ رکھتا۔ یوں

چھو کر اور زبان سے علاج کیا جاتا۔ ماہر مورخ (BUDGE) کا خیال ہے کہ ۔۔۔ ۸ ق م میں مصر میں جادو سے علاج کیا جاتا تھا۔ فراعنہ مصر کے مقبروں کی کھدائی سے بہت سے ایسے پتھر دستیاب ہوتے ہیں۔ جن پر تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر اسمیل نے ایبرز پیپرس کے انگریزی ترجمے میں لکھا ہے۔ کہ ایک ایسی سنگی تصویر میں کاہن اپنا ایک ہاتھ مریض کے پیٹ پر اور دوسرا اس کی پشت پر رکھے ہوئے ہے۔ خیال ہے۔ کہ اس تصویر میں کاہن سحر سے درد کا علاج کر رہا ہے۔

کاہن قیمتی پتھروں یا چمکدار چیزوں جن پر عجیب و غریب نقوش کندہ ہوتے تھے۔ نظریں جما کر اپنے آپ پر حالت بیخودی طاری کر لیتے تھے۔ اور ایسی حالت میں پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے۔

تنویم اور نفسیاتی علاج کے متعلق مصر قدیم کے ساحروں، کاہنوں اور طبیبوں کا طریق کار اکثر طب اور سحر سے مخلوط ہے۔ اس کی بعض صورتیں واضح ہیں۔ مثلاً آگ سے جلنے کے منتر صرف مریض کی تسلی کیلئے ہیں۔ یہ نفسیاتی علاج کی صورت ہے۔ ایسے بہت سے منتر اس مقصد کیلئے استعمال ہوتے تھے۔ کاہنوں کا مریض کو گھورنا، زبانی اثر ڈالنا اور اپنے آپ پر بیخودی طاری کرنا۔ توجہ خود نوعی، ذاتی تقناطیسیت اور خواب مقناطیسی ہی تو ہیں۔

مصر میں طب کی ابتدا توہم پرستی سے ہوئی۔ امتداد زمانہ کے ساتھ اس میں ترقی ہوئی اور توہمات کم ہو گئیں گو سحر اور طب کا تعلق کم و بیش ہمیشہ قائم رہا۔ تاہم طب نے اتنی ترقی کی تھی۔ کہ یونان کا مشہور مورخ اور سیاح ہیروڈوٹس (جس نے ۔۔ ق م میں ایران، شام اور مصر وغیرہ کا سفر کیا تھا) مصریوں کے نظام طب کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ بتاتا ہے۔ کہ مصر میں قابل اطبا کی بہتات ہے۔ ان میں بعض صرف مخصوص امراض کا علاج کرتے ہیں۔ لیکن مصر کی اٹھارویں اور انیسویں بادشاہی میں تھوتمس، امن ہوتپ اور رامس نامی فراعنہ کے دور حکومت میں طب کی جگہ پھر جادو اور منتر نے لے لی۔ تاہم علمی طب مذہبی جامے میں پوشیدہ ہو کر برابر ترقی کرتی رہی۔ کاہن جیسے نہ صرف علمی طب کی روشنی کو اپنے اخلاف تک پہنچاتے تھے۔ بلکہ عبادت گاہوں میں مریضوں کا علاج بھی علم طب کے نقطہ نظر سے کرتے تھے۔ حتیٰ کہ فراعنہ مصر کی تباہی کے ساتھ علمی باگ ڈور بھی یونانیوں اور رومیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

بنی اسرائیل

بنی اسرائیل کی قدیم کتب میں اس قسم کی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔ جو طب اور صحت سے متعلق ہیں۔ غذا، رہن سہن غسل، لباس، امراض جنسی و متعدی امراض وغیرہ بیماریوں سے تحفظ کے متعلق نہایت مفید امور تحریر کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جنسی زندگی، ایام ماہواری پر پابندیاں، جذامیوں کے علیحدہ رکھنے اور فحاشی کو دبانے کیلئے قابل قدر احکام ہیں۔ بایں ہمہ عبرانیوں کی تاریخ قدیم کسی مدون علمی طب کا پتہ نہیں دیتی۔ مورخین کی رائے ہے۔ کہ یہ طبی احکام بھی واضح طور پر بابلی اور مصری طبیبوں کے مرہون منت ہیں۔ اسرائیلیوں میں جادو، سحر، پیشین گوئیاں، الہام اور جنتر منتر، امراض و آلام کو دور کرنے کیلئے بڑی کثرت سے برتے جاتے تھے۔ ہر کام میں ان سے استمداد کی جاتی تھی۔ محققین کا خیال ہے۔ کہ یہ بھی بابلیوں اور مصریوں سے لئے گئے تھے۔

تعویذ کے اسرار ———— عبرانیوں میں تعویذ کا رواج عام تھا۔ اس کا سراغ ان سے پہلے نہیں ملتا۔ آج سے اڑھائی ہزار سال سے پہلے بھی ان میں اس کی شکل وہی تھی۔ جو اب یہودیوں، مسلمانوں اور عیسائیوں میں ہے۔ جھلی کے ایک کاغذ پر موسوی قانون کی چار نصیحتیں لکھ کر اسے چمڑے کی ایک ڈبیہ میں بند کر کے سر یا بائیں بازو پر باندھ دیا جاتا تھا۔ تعویذوں کو بڑی تعظیم سے رکھا جاتا تھا۔ یہودی مفسروں نے ان کی اہمیت یہاں تک بیان کی ہے۔ کہ تمام احکام الٰہی مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جو شخص اسے باندھتا ہے۔ وہ تمام گناہوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ فرشتے اسے گناہوں سے بچاتے ہیں۔ کتاب مقدس میں ہے۔ "جو شخص اپنے پاس تعویذ رکھتا ہے فرشتے اس کے چاروں طرف رہتے ہیں۔ اور مصائب سے بچاتے ہیں" تعویذوں کے اثرات یہاں پر بھی ختم نہیں ہوتے۔ وہ انسان کو نیک سیرت، انصاف پسند بناتے اور بدکرداری سے بچاتے ہیں۔ یہودیوں کے ایک فرقہ فریسی اور مذہبی پیشوا دوسرے فرقوں کیطرح اپنے تعویذ چھوٹے نہیں بناتے تھے۔ ان کے نزدیک اس کا طول و عرض اس امر کی دلیل تھی کہ اس کا حامل اہم شخصیت کا مالک ہے۔

امراض سے تحفظ ———— یہودیوں کا عقیدہ تھا۔ کہ جادو اور تعویذ سے شیطانوں اور ارواح خبیثہ کے اثرات اور امراض و آلام کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ان کے مذہبی پیشوا مختلف قسم کے اعمال بڑی کثرت سے کیا کرتے تھے۔ فریسی فرقہ والوں کا

امراض کے متعلق خیال دوسرا تھا۔ وہ امراض سے تحفظ کیلئے صرف احکام الٰہی کی بنا کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک بس یہی شے طبیب اور ارواح خبیثہ کے اثر کو دور کر سکتا تھا۔ تعویذ کا بھی مقصد یہی تھا۔ کہ وہ جادو سے بچائے اور اس سے پیدا شدہ امراض دور کرے۔

چین قدیم

چینی طب کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بابلی طب سے متاثر ہوئی تھی۔ اگرچہ بعض اشخاص کی رائے ہے کہ یہ بابلی طب سے بھی پرانی ہے۔ لیکن یہ خیال نا واقفیت پر مبنی ہے۔ کیونکہ چین میں سب سے پہلے شہنشاہ ہوانگ تی (۲۶۸۷ ق م) نے طب (دواؤں سے علاج) کی ابتدا کی تھی۔ یہ حکمران اس خاندان سے متعلق ہے جو چین کی تاریخ میں "پانچ شہنشاہوں کے خاندان" سے موسوم ہے۔ اس خانوادہ کا بانی شہنشاہ فوہی (۲۸۵۲ ق م) تھا۔ اس سے قبل چین کی تاریخ میں کسی بادشاہ کا نام نہیں ملتا۔ لیکن اس کے مقابلے میں طب کی ابتدا بابل میں ۵۰۰۰ ق م سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔ یہ رائے صائب معلوم نہیں ہوتی کہ بابلی طب ہی چینی طب کی سب کی اساس تھی۔ افراط و تفریط سے بچتے ہوئے یہ امر قرین قیاس ہے کہ چینی طب نے بابلی طب سے کم و بیش اثر لیا ہوگا۔

عقائد ——— چینیوں کا عقیدہ تھا کہ دنیا کی ہر شے ذی روح ہے۔ جسمانی مظاہر ایک غیر مادی روح کے اور تمام اشیاء مردوں کی ارواح یا دیوتاؤں کی تخلیق ہیں۔ ارواح خبیثہ لاتعداد اور ہر جگہ موجود ہیں۔ کائنات تاؤ کی کارفرمائی سے لیکن از خود ظہور میں آگئی ہے۔ تاؤ دو ارواح "یانگ اور ین" کا مجموعہ ہے۔ یانگ زمین، آسمان، زندگی غرض تمام خوبیوں کا اور ین تاریکی، موت وغیرہ کا خالق ہے۔ یہ دونوں اچھی اور بری بیشمار ارواح میں منقسم ہیں۔ پیدائش کے وقت ہر انسان دونوں اقسام کی روحیں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ انسان عالم صغیر ہے۔ اور عالم اکبر اسی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ موت کے بعد دونوں روحیں اس سے علیحدہ ہو کر اپنے اپنے خالق (یانگ یا ین) کے پاس چلی جاتی ہیں۔

طب ——— شہنشاہ ہوانگ تی کے بعد دوسرے اشخاص نے تشخیص و علاج کے اصول و قواعد مرتب کئے۔ تشخیص الامراض، علم الادویہ اور نبض و قارورہ کے متعلق بعض مفید اصول و نکات مرتب کئے گئے۔ اس طرح نباتی، حیوانی اور جمادی ادویہ کی طرف بھی بڑی توجہ دی گئی۔ چین کے لاماؤں کے پاس بعض خاص نسخے ہوتے تھے۔ [illegible] بہت کم توجہ دی گئی۔ اس لئے طب کی یہ صنف کمزور رہی۔ تانگ خاندان (۶۱۸ — ۹۰۵ء) کے شاہی طبی [illegible] (۱) دواؤں سے علاج کرنے والے (۲) جسم کے نازک حصوں پر سوئیاں چبھو کر علاج کرنے والے (۳) مالش [illegible] سے علاج کرنے والے (۴) سحر اور جادو سے امراض دور کرنے والے۔

معالج ——— چینیوں کے اعتقاد کے مطابق "وو" بعض انسانوں کو ایسی مخصوص قوتیں عطا کرتا ہے۔ جو انہیں عام لوگوں سے منفرد کرتی ہیں۔ ان چیدہ اشخاص میں اطباء اور معالجین بھی شامل ہیں۔ یہ معالج جادو، جنتر منتر اور ادویہ سے موت سے برسرپیکار رہتے ہیں۔ دور قدیم سے عہد حاضر تک ان خیالات میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ لیکن بنیادی اعتقادات تاحال غیر متزلزل ثابت ہوئے ہیں۔ چین میں جب دیا بھوت تھی "ٹو" کے پیرو کا غیب دان، پیشین گو اور جھاڑ پھونک وغیرہ کرنے والے تھے۔ امراض کی روحوں کو ڈرانے کے لئے عجیب و غریب حرکات کے مرتکب ہوتے۔ وہ کمر تک برہنہ ناچتے ہوئے جلوس نکالتے اور مجذوب ہو کر اپنے جسم اور زبان کو چھید ڈالتے۔ تلواروں کی دھاروں اور کیلوں سے چبھتے ہوئے تختوں پر لوٹتے۔

تنویم یا سحر ——— چین کی تنویمی اور نفسیاتی نوعیتیں دوسری قدیم تہذیبوں سے زیادہ متفاوت نہیں۔ روحانی طبیب کے پاس جب مریض جاتا۔ تو وہ اسے اپنے سامنے بٹھا کر منتر پڑھنا شروع کرتا۔ اس کے اثر سے چند ساعتوں کے بعد مریض بےخود ہو جاتا اور اسے اپنے گرد و پیش کا ہوش نہ رہتی۔ اس حالت میں عامل مریض پر بعض خاص اثرات پیدا کر سکتا تھا جس کی وضاحت چینی یوں کرتے ہیں۔ "معمول کی روح نے اپنا جسم چھوڑا۔ دوسری روح نے اس میں داخل ہو کر یہ آثار پیدا کئے"۔ اس عمل کے بعد مریض اکثر تندرست ہو جاتا تھا۔ یہ کیفیت ہو بہو تنویم کی سی ہے۔ چینی طب اور شاہی دربار میں آخر تک سحر کا اثر رہا ہے۔

ہند قدیم

اکثر اقوام کی طرح ہندو بھی علم العلاج (فن طب) اور آیوروید کو الہامی قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ ان میں بھی بہت سے اوہام باطلہ پائے جاتے

ہیں۔ اُن کے عقیدہ کے مطابق سب سے پہلے انہیں یہ علم حاصل ہوا۔

تاریخی حقائق ——— ہندوؤں کا ایقان ہے کہ مشر ستھان (مصر) کو آریوں نے آباد کیا تھا۔ تنتر کے ہوتا (نیل گھنڈی سے ہل کھینچ والا) نے مصر میں نیل تنتر کے مخفی علم کی (جس کے حامل صرف آریہ تھے) تعلیم دی۔ ہو تحفہ مصر یعنی دریائے نیل اسی دیوتا سے موسوم ہے۔ مہابھارت میں ہے کہ "نیاتی کے بیٹا روں بیٹے جن کو ان کے باپ نے سراپ (بددعا) دیا تھا ترک وطن کر کے مصر چلے گئے اور ملیچھ (ناپاک) قوموں کے بزرگ ہوئے۔ مصر جس کے معنی مخلوط ہیں۔ انہیں سے انتساب رکھتا ہے۔" یہ بیان تاریخ کے حقائق سے ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ جب آریہ وسط ایشیا سے نقل مکان کر کے ہندوستان میں گروہ در گروہ آ رہے تھے۔ اُس وقت مصر کی تہذیب ارتقاء کی بہت سی منازل طے کر چکی تھی۔ اغلب تو یہ ہے کہ مصر کے تمدن اور مذہبی تصورات نے جیسے دوسری قوموں کو متاثر کیا۔ ویسے آریوں پر بھی اثر انداز ہوئی ہوگی۔ اگرچہ ہمیں اس کے متعلق واضح ثبوت نہیں ملتا لیکن مصریوں اور آریوں کے مذہبی قصص اور روایتوں میں توارد معلوم ہوتا ہے۔

مذہبی قصے ——— ہندو تثلیث کے سہ ارکان وشنو (خالق دنیا پیدا کرنے والا) برہما (رازق، دنیا کی پرورش کرنے والا) اور شیو (فنا کنندہ، دنیا ختم کرنے والا) ہیں۔ آیور وید (جس کے معنی علم الشفا ہیں) کی ابتدا برہما سے ہوئی۔ اُن سے دکش پرجاپتی نے اسے حاصل کیا اور دو جڑواں بھائیوں اشونی اور کماروں کو سکھایا جنہوں نے اس فن میں ایسا کمال حاصل کیا۔ کہ ربانی اطبا تسلیم کئے گئے۔ اشونی اور کماروں سے اس کی تحصیل مہاراج اندر نے کی۔ ان سے اسے کس نے حاصل کیا۔ اس کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک روایت یہ ہے۔ کہ کچھ عرصہ بعد اس علم کو زوال آ گیا۔ تو بہت سے رشی منی ہمالیہ پر اکٹھے ہوئے۔ آپس میں مشورہ کے بعد بھاردواج رشی سے درخواست کی گئی جنہوں نے اسے اندر سے سیکھ کر دوسرے رشیوں کو سکھایا۔ انہیں سے اتری رشی نے سیکھ کر اپنے چھ شاگردوں کو سکھایا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ آیور وید کے تنزل کے بعد ایک دفعہ اندر نے سورگ سے اس دنیا پر نگاہ ڈالی تو بہت سے لوگوں کو امراض و آلام میں گرفتار پایا۔ انہوں نے دیوتاؤں کے ربانی وید دھنونتری مہاراج سے کہا۔ کہ وہ اس دنیا میں جا کر لوگوں کے دکھ کا مداوا کریں۔ دھنونتری نے اس حکم کی تعمیل کی اور راجہ بنارس کے ہاں دیوداس کی صورت میں جنم لے کر اس کام کو سرانجام دیا۔ دھنونتری کو ہندو "رب الشفا" سمجھتے ہیں۔ آیور وید میں اس کا رتبہ مصریوں کے "تحوت طب" اور یونانیوں کے اسقلیبیوس سے کم نہیں ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے۔ وہ دھنونتری کیر سمندر منتھن کے ساتھ برآمد ہوئے جن میں ایک امرت (آب حیات) بھی تھا۔ دھنونتری تصویروں اور مجسموں میں چار ہاتھوں میں سنکھ، چکر، جونک، اور امرت کا کلس پکڑے ہوئے ہیں۔ بعض تصاویر میں صرف دو ہاتھ ہیں۔ جن میں ایک میں جونک اور دوسرے میں جڑی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ تمام امراض جسمانی ہضم اور خون کے فساد کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اُن کے بیشمار شاگردوں میں سشرت (دل لگا کر پڑھنے والا) نے بڑی شہرت پائی۔ سشرت کی کتاب سشرت سنگھتا جو جراحی کے متعلق ہے بڑی مقبول ہوئی۔

سلب امراض کے طریقے ——— یہاں تک ہندی طب اور علم العلاج پر ہم نے ایک عام تبصرہ کیا ہے۔ اب ہم اپنی بحث کا رخ ان طریقوں کی طرف پھیرتے ہیں۔ جو ہند قدیم میں سلب امراض کے لئے رائج تھے۔ اور جن کا تعلق ہمارے موضوع سے ہے۔ برہمن جو دائمی طور پر مذہبی پیشوا قرار پائے تھے۔ مندروں میں مختلف دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں، بڑھاوے لے کر یا دلوا کر بھجنوں اور اشلوکوں وغیرہ سے سلب امراض کرتے تھے۔ مریض موسوم مندر میں دیوتا کے پاس یقین محکم کے ساتھ آتے۔ اور سجدہ ریز ہوتے تو نفسیاتی طور پر انہیں بہت تسلی و تشفی حاصل ہوتی۔ فی الحقیقت برہمنوں کی آمدنی بڑی حد تک ان امور کے ساتھ وابستہ تھی۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ یہ مذہبی عقائد کا حصہ بن گئے۔ جادو، جنتر منتر، ٹونے کے علاوہ اجرام فلکی کی گردش، خواب کی تعبیریں، چھینکنے، چوہیا کے کترے ہوئے کپڑے کے نشان تک سے پیشگوئی کی جاتی تھی۔ آسیب زدہ لوگوں یا آئینوں سے دیوتاؤں سے مشاورت، دست شناسی، علم النجوم، غیبی جوابات، منتروں سے نامردی پیدا کرنا، بھوتوں کو اتارنا وغیرہ بہت عام تھے۔ اسی پر بس نہیں تھا سانپوں، درندوں اور پرندوں تک کو سشم اور آنکھ کی قوت سے مسحور کرتے تھے۔

"سشرت سنگھتا" آیور وید کی وہ معرکہ آرا تالیف ہے۔ جس کی تعریف میں کیا قدیم اور کیا جدید تمام ہندو وید اور عالم رطب اللسان ہیں۔ مغربی ماہرین اس کو علمی حیثیت کی تالیف نہیں سمجھتے کیونکہ اس میں ... اور جراحی کے علاوہ سحر اور منتر بھجن وغیرہ سبھی ہیں۔ ادویہ کی تعریف میں استعداد مبالغہ آرائی کی گئی ہے۔ بعض کی غذائیں، امراض کے اسباب میں، آسیب اور ارواح خبیثہ شامل ہیں۔ ادویہ عجیب و غریب ہیں مثلاً

سانپ، ریچھ، گینڈا، الو، گدھ کا بول براز، کھال، بال وغیرہ"۔

قدیم ہندوستانی اطبا کی کتب کیطرح سنسکرت میں بھی امراض کے اسباب میں بھوت پریت اور ارواح خبیثہ کا عمل دخل ہے۔ قدیم آیورویدک کتب کے بیان کے مطابق بچوں کے اکثر امراض آسیب سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ آسیب مذکر اور مؤنث ہوتے ہیں۔ ہر آسیب کا جدا جدا نام ہے۔ بچوں کے آسیب کو "بال گرہ" سے موسوم کیا گیا ہے۔ انکی علامتیں اور علاج نہایت عجیب و غریب ہیں۔ اور بڑی تفصیل سے تحریر کئے گئے ہیں۔

سنسکرت سنگھتا کے اقتباسات ——— ناظرین کی دلچسپی کیلئے ہم سنسکرت سنگھتا میں سے بعض خاص اقتباسات لکھتے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے۔ کہ عوام کیطرح خود اطبا بھی توہمات کا شکار ہوا کرتے تھے۔ اور اب بھی ان توہمات کو درست تسلیم کرتے ہیں۔ اس کتاب میں رکھشا کرم کے بیان میں لکھا ہے۔ کہ زخم کو دیگر دوائی تدبیروں سے اچھا کرنے کے ساتھ ساتھ طبیب کو ذیل کے منتروں سے بھی اس کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ اس عمل کو اصطلاح ویدک میں رکھشا کرم کہتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں۔ عمل تحفظ۔

ذیل میں بعض منتروں کے ترجمے ملاحظہ فرمایئے:—

(۱) کرتیا نامی تکلیف اور راکھشسوں کے خوف کو دور کرنے کیلئے میں یہ رکھشا کرم کرتا ہوں۔ اس رکھشا کرم میں برہما میرے مددگار ہیں۔

(۲) ناگ پشاچ۔ گندھرب۔ پتر۔ یکھش اور راکھشس جو تجھے ستائیں۔ برہما وغیرہ دیوتا انہیں ہلاک کر دیں۔

(۳) پرتھوی اور آکاش میں چلنے والے نیز دشاؤں میں رہنے والے دیوتا اور تیرے اشٹ دیو تیری رکھشا کریں۔

(۴) برہم رشی، راج رشی، پہاڑ، سارے دریا اور سات سمندر تیرے محافظ ہوں۔

(۵) آگ تیری زبان کی، ہوا تیرے پران کی، چاند تیرے دہان کی اور برشمی تیرے ایمان کی رکھشا کریں۔

(۶) بجلی تیرے دماغ کی، بادل تیرے سماع کی اور تیری طاقت کی اور منو تیری رائے کی رکھشا کریں۔

ان ہی منتروں میں سے بعض یہ بھی ہیں:—

تیرا دکھ مٹ جائے۔ اور تو ہمیشہ بیماریوں سے بچا رہے۔ اس طرح [illegible] [illegible] کرے۔

ان مقدس منتروں کی بدولت تو کرتیا نامی تکلیف اور بیماری سے نجات پاکر مدت دراز تک زندگی سے لطف اٹھا۔

اسی طرح ساتھ ہی اس حصے میں بعض دلچسپ تصورات ملتے ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے۔ کہ انسان کو بعض گرہیں پکڑ لیتی ہیں۔ اور تکلیف میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ مثلاً مخفی امور کا جاننا۔ مستقبل کا حال بتا دینا۔ چیخنا، چلانا، متحمل مزاجی یا خوش الانسانیت کام کرنا۔ وغیرہ

گرہوں کو آٹھ اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دیوگرہ۔ آسر گرہ۔ گندھرب گرہ۔ یکھش گرہ۔ پتر گرہ۔ بھجنگ گرہ۔ راکھشس گرہ۔ پشاچ گرہ۔

دیوگرہ سے پکڑے ہوئے انسان میں یہ علامات نمایاں ہوتی ہیں۔ صابر۔ پاک صاف۔ خوشبودار اشیا اور پھول مالاؤں کا خواہشمند۔ ہوشیار صاف سنسکرت بولنے والا۔ صاحب جلال۔ آنکھیں نہ جھپکنے والا۔ لوگوں کو ور دینے والا۔ برہمنوں کا گرویدہ۔

غرض اسی طرح آٹھوں گرہوں کی علامات عجیب و غریب پیرائے میں بیان کی گئی ہیں۔ اور ان کے انسان کے جسم میں داخل ہونے کے اوقات بھی بتائے گئے ہیں۔

ان گرہوں کو دور کرنے کیلئے جو تدبیریں بتائی گئی ہیں۔ ذرا ان کو بھی سن لیجئے۔ چنانچہ لکھا ہے:—

"ان گرہوں کو دور کرنے کیلئے وید کو چاہیئے۔ کہ جب نیم اندھیرا ہو اس سے کام لے۔ خوشبودار پھولوں کی مالائیں۔ لال رنگ کے پھول، شہد۔ گھی۔ کپڑے۔ شراب۔ گوشت، دودھ اور خون میں سے جو جس گرہ کو پسند ہو۔ وہی اسے دینا چاہیئے۔ جو گرہ جن کے وقت انسان کو پکڑ لیتے ہیں۔ انہیں دور کرنے دن ہی کے وقت یہ دینا چاہیئے۔ دیوگرہوں کیلئے مندر میں ہون کرا کے گٹ۔ سوستکھ۔ فال پتے، گھی، چھترا اور کھیر کی بلی دینی چاہیئے۔ اسروں کیلئے حسب موقع چوراہے میں بلی دیں۔ راکھشسوں کیلئے پورا بے اور ہولناک مقامات میں بلی دیں۔ پشاچوں کیلئے ویران اور اجڑے ہوئے مقامات پر بلی دیں۔ یہ بلیاں دیتے وقت بعض منتر پڑھنے چاہیئیں۔

یونان قدیم

دیب الشفا ——— یونان میں یا فیثاغورث کی ابتدا ایتھنز والے کی عوام میں اس کے سحر انگیز معالجات کی بڑی شہرت

ہوئی۔ قدیم یونانی بالاتفاق اسے موجد طب اور رب الشفا تسلیم کرتے تھے۔ امیر ابوالوفا نے مختار الحکم میں تحریر کیا ہے کہ اسقلیبیوس حضرت ادریس ع کا شاگرد تھا۔ بعض نے بیان کیا ہے۔ کہ وہ طوفان نوح سے بھی پہلے گزرا ہے۔ ہر چند آراء صحت سے دور ہیں۔ بالخصوص ثانی الذکر تو کسی طرح قرین قیاس نہیں۔ اسقلیبیوس نے نوے سال کی عمر پائی۔ اس کی موت کے متعلق یہ روایت بیان کی جاتی ہے۔ کہ فرشتے احکام الہٰی کی تعمیل میں ایک آتشی ستون پر بٹھا کر عالم بالا کو لے گئے۔ یونانی علم الاصنام میں اس کی دو بیٹیاں ہیں۔ ہائجیا (صحت کی دیوی) اور پینیشیا (امراض دور کرنے والی دیوی) چونکہ سب سے پہلے اس نے حیرت انگیز معالجات کئے۔ اس لئے اس کی عظمت کے بہت سے قصے مشہور ہو گئے۔ شاعر اعظم ہومر نے اپنی شہرہ آفاق رزمیہ نظم ایلیڈ میں اس کے گن گائے ہیں۔ دوسرے شعراء نے اسے شفا کا دیوتا قرار دیا۔ جہاں کہیں وبا پھیلتی وہاں اسقلیبیوس کی پرستش شروع ہو جاتی۔ مختلف مقامات پر اس کے دو سو سے زیادہ مندر تعمیر کئے گئے ان میں سب سے زیادہ مشہور وہ مندر تھا جو شہر قوس کی ایک پہاڑی کے اوپر درختوں کے درمیان ایک پر فضا ماحول میں بنایا گیا۔ اس میں اسقلیبیوس کا مجسمہ رکھا ہوا تھا جس کے سامنے مریض سر نیاز جھکاتے اور صحت رفتہ کی واپسی کیلئے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ یہاں زرد رنگ کے بہت سے بے ضرر سانپ تھے۔ جو ایسے سدھے ہوئے تھے۔ کہ مریض کے مقام مرض کو اپنی زبان سے چاٹتے تھے۔ بقراط اپنے زمانہ میں اسی مندر میں علاج کیا کرتا تھا۔ اس نے اس کا نام انتہ زکین رکھا ہوا تھا۔

رب الشفا کے معبد ——— مریض مندر میں داخلے سے پہلے غسل کر کے پاک و صاف ہو جاتا۔ اس کے بعد اسقلیبیوس کے مجسمے کے سامنے بعض رسمیں ادا کی جاتیں اور اسے معینہ وقت پر ایک بڑے دیوان خانے میں سونے کی ہدایت کی جاتی۔ خواب میں وہ دیوتا کی زیارت سے مشرف ہوتا جو اسے مرض کی دوا یا تدبیر بتاتا تھا۔ یہ خواب پیچیدہ اور الجھے ہوئے اور دیوتا کا ارشاد رمز و کنایہ کا پہلو لئے ہوئے ہوتا تھا۔ اس کی تعبیر صرف مندر کے پجاری کر سکتے تھے۔ جو مریض کے علاج معالجہ کے بھی ذمہ دار ہوتے تھے۔ مریض ان ہدایات پر عمل پیرا ہو کر بالعموم تندرست ہو جایا کرتا تھا۔ حصول صحت کے بعد وہ حسب مقدور نذر و نیاز کرتا اور اکثر اپنے مرض کا حال سونے چاندی کی لوحوں یا پتھروں پر کندہ کرا کر مندر میں رکھ دیتا تھا۔ بعض سنگی کتبے اسقلیبیوس کے مندروں کی کھدائی سے دستیاب ہوئے ہیں۔ جن کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

خواب معبد ——— میری ہملٹن ایم اے نے ایک دلچسپ کتاب انکیوبیشن ان دی کیور آف ڈیزیز ان پاگان ٹیمپلز Incubation in the cure of Disease in pagan Temples تحریر کی ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے۔ کہ قدیم یونان، ایشیا کوچک، روم اور مصر کے مندروں میں سلا کر (خواب معبد) Temple Sleep کیسے علاج کیا جاتا تھا۔ وہ تحریر کرتی ہیں:۔

" مریض رات کے وقت مندر میں سلایا جاتا۔ خواب میں آ کے دیوتا کی زیارت ہوتی جو یا تو ماؤف عضو کو چھو دیتا تھا۔ یا موثر اور پر یقین الفاظ کہہ دیتا تھا۔ علاج کے اختتام پر مریض صحت یاب ہو جاتا۔ رخصت ہونے سے قبل لوحوں پر شکرانہ کے الفاظ کھدوا کر احسان مندی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اس طرح جن امراض کا علاج کیا جاتا تھا۔ ان میں آنکھوں کی خرابیاں، نابینائی، فالج، اندرونی رسولیاں، پرانے زخم، استسقاء، گنٹھیا اور نقرس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلہ میں بعض مثالیں عجیب و غریب ہیں۔ ایک اندھا شخص اسقلیبیوس کے مندر میں آیا۔ اس کی آنکھیں بالکل بیکار ہو چکی تھیں۔ اور چشم خانے خالی تھے۔ جب وہ آیا۔ تو مندر میں سے بعض لوگوں نے کہا۔ یہ احمق اپنی بینائی تندرست ہونے کا خیال لے کر آیا ہے۔ تاہم یہ شخص مریض کی حیثیت سے آیا تھا۔ اس لئے حسب معمول دیوان خانہ میں سلا دیا گیا۔ خواب میں اسے دیوتا کی زیارت ہوئی۔ جس نے کچھ دوائیں تیار کر کے اس کی آنکھوں میں ڈالیں۔ صبح کو جب وہ بیدار ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کی دونوں آنکھوں کی بینائی لوٹ آئی ہے۔ شو مقیم کا ایک عسیر العلاج مریض غذا، ورزش اور غسل کے متعلق دیوتا کی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر شفا یاب ہوا۔ ایک شخص کے گھٹنے مفلوج ہو چکے تھے۔ اس نے دیوتا کو گاڑی میں بیٹھے ہوئے دیکھا جس نے گاڑی اس پر ہانک دی۔ چنانچہ گھوڑوں نے اسے روند ڈالا۔ وہ خواب میں سیدھا اٹھ بیٹھا اور صبح کو شفا یاب ہو کر روانہ ہو گیا۔ ان مندروں کے پجاری مریضوں پر اثر ڈالتے تھے۔ کہ وہ قربانیاں اور نذریں دیں۔ مندروں سے بڑی بڑی رقمیں متعلق تھیں۔ بعض اوقات جب پیشکش معقول نہ ہوتی تھی۔ تو یہ کہا جاتا۔ کہ مریض کا معاملہ کھٹائی میں ڈال دیا گیا۔

مریض زیادہ مسلط کر [illegible] جب عیسائیت کو عروج ہوا۔ تو بہت سے مندر کلیسا [illegible] میں تبدیل ہو گئے۔ اور اس قسم کا معالجہ [illegible] میں جاری رہا۔ البتہ [illegible] کی جگہ پادری نے لے لی۔

اس تمام سلسلہ میں نفسیاتی علاج اور تنویم کی سرفرازی کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے۔ پجاری مریض کے دماغ پر اس قسم کا اثر ڈالتا تھا۔ اور ماحول اس طرح کا ہوتا تھا کہ اس کا نفسیاتی ردعمل حسب منشا حاصل ہو جاتا تھا۔

اسقلیبیوس کے بعد دوسرے اطباء نے وقتاً فوقتاً شہرت حاصل کی۔ لیکن طب کی تدوین کا سہرا بقراط (۴۶۰ ق م) کے سر رہا۔ بقراط اسقلیبیوس کی انیسویں پشت سے تھا۔ اس سے قبل طب اسقلیبیوس کی وصیت کے مطابق صرف اس کے خاندان تک محدود تھی۔ بقراط کا دوسرا احسان ہے۔ کہ اس نے طب کے اصول و قواعد کو مرتب کرنے کے علاوہ اسے صرف اپنے خاندان تک محدود نہ رکھا۔ بلکہ عام کر دیا۔ اس کے بعد مختلف اطباء نے طب میں مفید اضافے کئے۔ جالینوس (۱۳۰ء) نے طب یونانی کو ایک مکمل شکل میں ترتیب دیا۔ اس نے تشریح اور جراحت میں اضافے کئے۔ ادویہ کی تحقیق میں دلچسپی لی اور قرابادین کو ترتیب دیا۔ موجودہ طب اسلامی اور طب جدید کی بنیاد طب جالینوسی پر ہے۔

روم قدیم

رومی طب ۔ ابتداء میں رومی صرف جادو وغیرہ سے امراض کا علاج کرتے تھے۔ لیکن روم کے عروج کے ساتھ طب یونانی بھی روم میں جا پہنچی۔ بہت سے یونانی اطباء روم میں جا کر مقیم ہو گئے۔ گو روم میں بہت سے مشہور اطباء ہوئے ہیں۔ انہوں نے طب یونانی میں خاص اضافات نہیں کئے۔ لیکن بہت حد تک اسے زندہ رکھا۔ روم کی تباہی کے بعد یورپ اپنے مشہور عہد تاریک میں گم ہو گیا۔ اور بالآخر علم و دولت کے ساتھ طب کی دولت بھی اسلامیوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ جنہوں نے اسے چار دانگ عالم میں پھیلا دیا۔

دست شفا ۔ شہنشاہ کلوڈیوس کے متعلق تاریخ میں ذکر ہے کہ وہ خاص طریقے سے ہاتھ لگا کر امراض دور کر دیتا تھا۔ ایکلا بیوس ایک طبیب تھا۔ جو مریضوں پر نیم بیہوشی سی طاری کر کے ان کا علاج کرتا تھا۔ وہ مریض کے جسم پر ہاتھ پھیر کر مرض دور کر دیتا تھا۔ اس کے شاگرد مریض کے جسم کو خاص طریقے پر سہلا کر اس پر نیند طاری کر دیتے تھے۔ زیادہ دیر سہلانے سے مریض پر گہری نیند طاری ہو جاتی تھی۔

ایران قدیم

ایران قدیم کی تاریخ گمنامی کے پردے میں اس طرح مستور ہے۔ کہ اس کی دو ہزار سالہ تاریخ میں اس کے اپنے نظام طب کا سراغ دستیاب نہیں ہوتا۔ اس لئے مؤرخین کا خیال ہے کہ ایران کا کبھی بھی اپنا کوئی مستقل مذہب یا طب نہیں تھا۔ جو دنیا پر اثر انداز ہوا ہو۔ زردشت کی ہستی مذہب کے سلسلہ میں ایک استثناء سمجھی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے مذہب کو بعض خاص مواقع کے علاوہ کبھی ایران میں بھی زیادہ عروج حاصل نہیں ہوا۔ اور اس کے پہلو بہ پہلو دوسرے مذاہب موجود رہے۔ زردشت سے قبل ایرانیوں کے مذہب کی بنیاد بابل اور یونان کے مذاہب پر تھی۔ ایران کے نظام طب کے متعلق کچھ نہ معلوم ہوتے ہوئے بھی یہ خیال ہے۔ کہ دوسرے مذہب کی طرح طب بھی غیروں کی ہی ہو گی۔ بابل طب کا پہلا مرکز ہونے کے علاوہ ایران سے ملحق بھی تھا۔ اس لئے ابتداء میں اس کا اثر ہوا ہو گا۔ اس کے بعد شاید مصر اور آخر میں یونان کے عظیم الشان نظام طب نے اثر ڈالا۔ اس کی سب سے قوی شہادت جندی شاپور کا مشہور طبی مدرسہ ہے۔ طب کے ہمراہ لازماً ان ممالک کے تنویمی اور نفسیاتی طریق بھی آئے ہونگے۔ جادو، منتر جنتر، جھاڑ پھونک، معبدوں میں پجاریوں کے اعمال اور دیوتاؤں سے دعائیں مروج ہونگی۔

عیسائیت

علم العلاج پر عیسائیت کا اثر ۔ علم العلاج پر عیسائیت کا جو اثر ہوا اور اس اثر کی وجہ سے جو اوہام و نظریات قائم ہوئے۔ وہ چونکہ اس زمانہ میں تقدس اور الہامی سمجھے جانے کے قابل ہیں۔ اس لئے عیسائی مؤرخین نے عام طور پر ان کے اظہار میں اغماض سے کام لیا ہے۔ اور اگر کہیں ان کا ذکر کیا بھی ہے تو قارئین کی ذہنیت کو بدلنے کے لئے پہلے دو چار تمہیدی سطروں میں کوئی تاویل کر دی ہے۔ بہر حال جب تاریخ عیسائیت کا دقت نظر سے علم العلاج کے متعلق [illegible] مطالعہ کرتے ہیں۔ تو یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ عیسائی مذہب نے اس فن پر کافی اثر ڈالا ہے۔ اور اس اثر کو جہاں ایک طرف [illegible] وہاں دوسری طرف بڑی حد تک [illegible] کے مخالف بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ہمارے اپنے

خیالات نہیں ہیں۔ بلکہ خود عیسائی مورخ بھی اس کے معترف ہیں۔ مسٹر ایڈورڈ تھیوڈور واتھنگٹن لکھتے ہیں۔

"عیسائیت علم طب پر جن طریقوں سے اثر انداز ہوئی۔ ان کا اصل اصول تین باتوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) عیسائیت نے امراض کے قدیم تصورات و نظریات کو برقرار رکھنے میں مدد کی۔

(۲) جب اس مذہب کو پوری طرح فروغ ہو گیا۔ اور یہ اچھی طرح غلبہ پا چکا۔ تو طرح طرح کی حدیں جاری کر کے اس نے لوگوں کی آزادانہ رائے اور تحقیقات پہ پابندیاں لگا دیں اور میدان تنگ کر دیا۔

(۳) مذہبی مناقشات اتنے وسیع اور شدید صورت میں رونما ہوئے کہ ان پر اب غور کرنے سے بعض اوقات تو یہ شبہ ہونے لگتا ہے۔ کہ اس زمانہ کے لوگوں کی عقلوں کو انہوں نے بالکل ہی سلب کر دیا تھا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ ظاہر ہے۔ اور ان کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مبالغہ میں شامل نہیں ہوگا۔ کہ علم العلاج کے معاملہ میں عیسائی مذہب کے پیرو بھی، خبیث روحوں اور بھوت پریت کے قائل تھے۔ اس سلسلہ میں واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جسے مسٹر ایڈورڈ تھیوڈور واتھنگٹن نے نقل کیا ہے۔

ارباب تثلیث کی توہم پرستیاں سینٹ بے سل ایک بہت ہی ضعیف البنیہ شخص تھا۔ اس میں بیمار ہونے کی استعداد بہت زیادہ تھی۔ اس لئے وہ طب کی طرف زیادہ توجہ دیتا تھا۔ اور اکثر اس کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ یہ فن طب کو سب سے معزز پیشہ بتایا کرتا تھا۔ اس نے "مرگی" کے سلسلہ میں حتی الامکان تمام بڑے بڑے مشہور رسائل مطالعہ کئے۔ یہ رسائل ایسے مصنف کے لکھے ہوئے تھے۔ جو سینٹ مذکور کے زمانہ سے ۸۰۰ سال پیشتر تمام امراض کی توجیہ کر چکا تھا۔ اور ان میں وہ معلومات تھیں جن کی وجہ سے طب کی ترقی کا بہت کچھ سامان ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود سینٹ نے ان کی مخالفت کرنی شروع کر دی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔ کہ تمام بیماریاں فطرت کی پیدا کردہ نہیں ہیں۔ یا تمام امراض اپنے غذاؤں اور بری عادتوں کا ہی ثمرہ نہیں ہیں۔ بلکہ بعض بیماریاں ایسی بھی ہیں۔ جو بعض بھولے ہوئے گناہوں کی پاداش کے ساتھ علاوہ اضافہ کر دیا کرتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ جب بھی ہمیں اس بات کا شعور ہو جاتا ہے۔ کہ یہ تکلیف ہمیں اپنی بد پرہیزی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ تو ہم اس کے ازالہ کیلئے طبیب کے پاس ہی نہیں جاتے ہیں۔ بلکہ اپنے نفس کو سنوارنے اور سدھارنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں اور اس کی اطاعت کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ خدا مناسب وقت پر اس کو زائل کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض امراض شیطان کی وجہ سے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں بھی ہمیں زہد و تقویٰ کی ہی کوشش کرنی چاہیئے۔" یہ مغربی یورپ کا حال ہے۔ اس کے مقابلہ میں مشرقی یورپ میں طب اور امراض کے معاملہ میں زیادہ سائنٹفک نظریات مانے جاتے تھے۔ اور اس زمانے میں بقراطی روش کے مطابق جو بھی اصول وضع کئے گئے تھے۔ ان کی پیروی بہت کچھ کی جاتی تھی۔ اس کے برعکس مغربی یورپ میں تو یہ حال تھا۔ کہ امراض کے معاملہ میں دینیات اور مذہب کی طرف نظر کی جاتی تھی۔ اور مذہبی طریق علاج سے امراض کا ازالہ کیا جاتا تھا۔ اور یہ عقیدہ عام تھا۔ کہ دعاؤں اور مقرب بارگاہ ہستیوں کے مقابر وغیرہ کے واسطہ سے بیماری کو دور کرنے کا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ طب کو مغربی یورپ میں نہ صرف ایک بیکار چیز سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ اسے بری نظر سے بھی دیکھا جاتا تھا۔

کفار کی تقلید ۔ کتاب مذہب کی بعض اہم شکلوں میں رب الطب کی پوجا اور عبادت عرصہ تک جاری رہی اور عیسائیت نے کافی کامیابی اور وسعت حاصل کرنے کے بعد بھی اس طریقہ کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ بلکہ جیسا کہ مس میری ہیملٹن نے لکھا ہے۔ کہ اسقلیبیوس کے مندروں کو کلیساؤں میں تبدیل کر لیا گیا تھا۔ اور ان میں وہی طریقے بدستور جاری تھے۔ جو پہلے ہی سے ہوتے چلے آ رہے تھے ان طریقوں میں عارضی طور پر تو کچھ رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی اور کچھ عرصے کیلئے یہ رسم بند کر دی گئی تھی۔ لیکن کلیساؤں میں آخر کار وہی منظر پھر نظر آنے لگا تھا۔ جو اسقلیبیوس کے مندروں میں نظر آتا تھا۔ اس طرز علاج کی عارضی بندش کی وجہ عیسائیوں کا احتجاج اور شاہی فرمان تھے۔ جو لوگ ہیں طاق نسیان پر رکھ دیئے گئے۔ اور عیسائیوں نے جلد ہی ان طریقوں کی نقل کرنی شروع کر دی۔ جن کی وہ پہلے مذمت کر چکے تھے چنانچہ صحت یاب کئے ہوئے اعضا و جوارح کے جو نمونے پہلے اسقلیبیوس کے مندر میں لٹکے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہ اب کلیساؤں میں دکھائی دینے لگے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد یہ ہوا کہ اس طرز عبادت میں تبدیلی واقع ہو گئی جو اسقلیبیوس کے زمانہ میں مروج تھا۔ اور دو شہیدوں یعنی عدسہ کے جوگن اور اسکندریہ کے سائرس کی لاشوں کی ہڈیوں کو طرح طرح کا ان کو شہر سے باہر ایک دیہات پر منتقل کر دیا گیا تھا۔ جیسے شیطانوں اور خبیث

دیوتاؤں کی پرہجوم جگہ کہا جاتا تھا۔ اس مقام پر ایک کلیسا تعمیر کر دیا گیا تھا اور اس کے اندر خواب بمعیار کا وہی طریقہ پیشے کار لایا جاتا تھا جو پرانا کنا مذہب کے پیروں کے مندروں میں عمل کیا جاتا تھا۔ اس مثال سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس طرح کلیساؤں میں کام ہوتا تھا۔ اسکندریہ کے ایک شخص کو غذا میں زہر دے دیا گیا۔ اور وہ شدید تکلیف میں مبتلا ہو گیا۔ معالجوں نے اس کا بہت علاج کیا۔ لیکن بے سود۔ آخر کار وہ سائرس اور جون کے مذکورہ بالا کلیسا میں جا کر سویا۔ چنانچہ وہ دونوں مقدس ہستیاں اس کو خواب میں دکھائی دیں۔ اور انہوں نے ایک زہریلا سانپ کھانے کا حکم دیا۔ یہ سن کر وہ شخص متعجب ہوا۔ اور اس نے سوچا کہ اس کے گناہوں کی وجہ سے شیطان نے اس کام میں دخل دے دیا ہے اور مقدس روحوں کا بھیس بھر کر وہ خواب میں نمودار ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ اس خیال سے دوسری مرتبہ پھر سویا۔ لیکن اس کو پھر وہی بتایا گیا جو پہلے بتایا گیا تھا۔ لیکن اس پر بھی اس کو یقین نہ آیا۔ اور وہ اس حکم کی تعمیل میں دیر کرتا رہا۔ آخر کار کلیسا کے پادریوں نے رحم کھا کر اس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ترکا بھونے پر باہر چلے اور کلیسا کے آس پاس جو چیز اسے ملے اسے صبر شکر کر کے کھا لے۔ چنانچہ وہ صبح کو حسب ہدایت آیا اور اس نے دیکھا کہ تربوز کے مانند کوئی چیز پڑی ہوئی ہے۔ اور وہ اس کو کھا گیا۔ لیکن جب وہ اس کو تقریباً ختم کر چکا تو اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں تربوز کا چھلکا وغیرہ تو نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بجائے سانپ کی دُم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو اتنا صدمہ پہنچا کہ اُسے شدید قے ہونے لگی۔ اور قے میں نہ صرف سانپ خارج ہو گیا۔ بلکہ کچھ عرصہ پیشتر اس نے جو زہر کھایا تھا وہ بھی خارج ہو گیا۔ اس سے مورخین نے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ کلیساؤں میں سینٹ یا درویشان مذہب جو علاج کیا کرتے تھے۔ وہ علاج بالضد نہ ہوتا تھا۔ بلکہ علاج بالمثل ہوتا ہے۔ جو آجکل ہومیوپیتھی کا اصل اصول ہے۔

رہبانی طب ۔ قرون وسطیٰ میں رہبانی طب کا بہت زور شور رہا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ عیسائیت علم العلاج کے معاملہ میں کافی توہم پرست بنی رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جس میں ہنری دوم کا علاج کیا گیا تھا۔

۱۰۰۲ء میں سینٹ ہنری جو بعد میں جرمنی کا شہنشاہ منتخب ہوا تھا۔ پتھری کی شدید تکلیف میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن طبیب اُس کا کوئی علاج نہ کر سکے۔ وہ مونٹے کیسینو (Monte Cassino) کی خانقاہ میں آیا اور سینٹ بنڈکٹ سے امداد طلب کرنے لگا۔ چنانچہ وہ سویا۔ اور اس کو خواب میں بشارت ہوئی۔ اُس نے دیکھا کہ سینٹ بنڈکٹ ایک جراح چاقو لے کر اس کے پاس آیا ہے اور اس نے اس جگہ کو چیر ڈالا ہے۔ جہاں یہ پتھری تھی۔ پھر اس نے پتھری کو نکال کر شہنشاہ کے ہاتھ پر رکھ دیا اور زخم فوراً ہی اچھا ہو گیا۔ شہنشاہ بیدار ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھ پر پتھری پا کر پادریوں اور شہزادوں کو بلوایا اور ان سے بتایا کہ دیوتا نے اس کے ساتھ کتنا اچھا سلوک کیا ہے۔ اس کے بعد اس نے شاہی کلیسا میں بڑے بڑے تحفے بھیجے۔

اسی طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یورپ میں عرصہ تک یہ طریقے رائج رہے۔ تقریباً اس سے ہزار سال قبل اسقلیبیوس کے مندروں میں یہ رواج پا چکے تھے۔

اسلام

اسلام سے پہلے ۔ اسلام دین فطرت ہے۔ جس کا آفتاب ہدایت دنیا کی ضیا پاش کرنیں بکھیرتا ہوا طلوع ہوا۔ اور باطل کی تاریکیوں کو کائنات کے گوشے گوشے سے مٹا کر چھا گیا۔ اسلام کی پہلی کرن جس سرزمین پر پڑی۔ وہ عرب کی سرزمین تھی۔ جس میں جاہلیت، اوہام باطلہ، کفر و الحاد اور مادیت سوز رسوم و عقائد کا دور دورہ تھا۔ جہاں لڑکی پیدا ہونا بدبختی اور ذلت کی دلیل قرار دیا جاتا تھا۔ جہاں خدا کو چھوڑ کر بتوں کے آگے سر جھکائے جاتے تھے۔ اور انہی سے ہر کام میں مدد مانگی جاتی تھی۔ جہاں ہوس ناکی اور فحاشی کا بازار گرم تھا۔ اور جہاں نہ روحانیت سے ہی کوئی آشنا تھا۔ اور نہ مادیت ہی کا مفہوم سمجھا جاتا تھا۔

ظاہر ہے کہ جہاں گمراہی کا یہ عالم ہو۔ وہاں اوہام باطلہ کو کتنا عمل دخل ہوگا۔ اور سحر، طلسم اور بے بنیاد افسونوں کو کتنی اہمیت دی جاتی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ باشندگان عرب اسلام کی تعلیمات سے آشنا ہونے سے پہلے، جہاں اور مصیبتوں کے وقت بتوں سے التجائیں کرتے تھے۔ وہاں رفع امراض کے لئے بھی دیوتاؤں کے حضور میں منتر پڑھتے تھے۔ یا جھاڑ پھونک کرتے۔ اور ایسے گنڈے تعویذوں سے کام لیتے تھے جن میں سراسر شرک اور کفر بھرا ہوتا تھا۔ لیکن اسلام کی شمع ہدایت نے انہیں گمراہی سے نکال کر وہ راہ دکھائی۔ جس کی راستی کو عقل تسلیم کرتی ہے اور جو فطرت کے عین مطابق ہے۔ یعنی اسلام میں جادو اور غیر اللہ کو اپنی نجات کا ذریعہ قرار دینا اور ان سے مدد طلب کرنا امر بے راہ روی ہے۔ اسلام سے پہلے عرب میں کیا طریقہ رائج تھے۔ اور وہاں کے باشندے سحر کو کس حد تک

مانتے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے۔ کہ عربی کے مشہور شاعر جریر نے اپنی بیٹی ام غیلان کی شادی ابلق ساحر کے ساتھ کی تھی جس کی وجہ یہ تھی۔ کہ ابلق نے اپنے ساحرانہ طریقوں سے جریر کو تپتی کی بیماری سے نجات دلائی تھی۔

مسلمانوں کا طرز عمل - یہ قدر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اسلام نے غیر اللہ سے مدد مانگنے اور ان امور کو اپنانے کے خلاف سخت ترین احکام صادر کئے۔ جو غیر اللہ کی طرف توجہ کا باعث بنتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو مسلمانوں نے سحر و طلسم کو سیکھا۔ اور نہ سلب امراض کے سلسلہ میں ان کو اپنی نجات کا ذریعہ قرار دیا۔ اسلام سے پہلے سحر و طلسم پر دیگر زبانوں میں بہت سی کتابیں موجود تھیں یا اور مصر کے قبطیوں اور عراق کے کلدانیوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔ لیکن مسلمانوں نے حرمت سحر کی وجہ سے ان کا بہت کم ترجمہ کرایا۔ صرف چند کتابیں ترجمہ ہوئیں جیسے فلاحت نبطیہ وغیرہ، اور ان میں بھی سحر وغیرہ کا ذکر ضمناً ہی تھا۔ اس لئے مسلمانوں میں سحر کی تبلیغ بہت ہی دھیمی رفتار سے، اور بہت ہی کم ہوئی۔ البتہ حدیث خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم کے مطابق، جب مسلمانوں میں دین کی طرف سے کچھ کچھ بے پرواہی ہونے لگی۔ تو مسلمان بھی ایک حد تک اس قسم کے علوم میں لگ گئے اور انہوں نے بھی اس فن میں کتابیں لکھنی شروع کیں۔ مثلاً مصاحف کواکب سبعہ۔ کتاب علم ہندی وغیرہ۔ اس کے بعد مشرقی مسلمانوں میں جابر ابن حیان پیدا ہوا۔ جس نے نئی نئی باتیں نکال کر بیان کیں۔ جابر کے بعد اندلس میں مسلمہ بن احمد مجریطی کا زمانہ آیا۔ جو ریاضیات و سحر میں امام وقت ہوا ہے۔ اس نے جابر کی کتابوں کا خلاصہ کیا اور مسائل کی تنقیح کر کے سب کو ایک کتاب غایت الحکیم میں جمع کر دیا۔ اس کے بعد اس فن میں کسی مسلمان نے کوئی کتاب ابن خلدون کے عہد تک نہیں لکھی۔

اسلامی نظریہ - از روئے قرآن و حدیث جادو میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ کیونکہ جادو کی تاثیر بالکل عقلی اور قابل تسلیم ہے۔ سائنس قرآن مجید میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ ولکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر وما انزل علی الملکین ببابل ھاروت وماروت وما یعلمان من احد حتی یقولا انما نحن فتنۃ فلا تکفر فیتعلمون منھما ما یفرقون بہ بین المرء وزوجہ وما ھم بضارین بہ من احد الا باذن اللہ۔

اس کے علاوہ اس قسم کی بہت سی احادیث و روایات ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ پر کفار نے جادو کیا۔ اور آپ پر اس کا اثر ہوا۔ آپ کو معلوم ہوتا کہ آپ کچھ کام کر رہے ہیں۔ حالانکہ آپ کچھ نہ کرتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ شدت سے بخار چڑھا رہتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا تھا۔ کہ آپ چلنے پھرنے سے معذور ہو جاتے تھے اور کبھی حلق خشک ہو جاتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے معوذتین نازل فرمائیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے۔ کہ جب یہ سورتیں جادو زدہ پر پڑھ کر دم کی گئیں تو من شر النفثت فی العقد پر ہر بار ایک گرہ کھلتی گئی۔ علاوہ ازیں قرآن حکیم میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا مقابلہ کئی جگہ مذکور۔ فرعون کے ساحروں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا عصا ڈالنے کے لئے کہا۔ ان کا سحر زائل ہو گیا۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ سحر کو مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن سحری اعمال کے سلسلہ میں ساتھ ہی مسلمانوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ وہ اسماء الٰہی کے سامنے قائم نہیں رہ سکتے۔

روحانیت - اسلامی نظریہ ہمیشہ روحانی قوتوں کا ضامن رہا ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ تصوف و معرفت کے ذریعہ روحانی قدم دیتے اور روحانی عقیدہ میں پختگی پیدا کر کے خدائے قدوس سے مدد مانگنے اور اس کی رضا ڈھونڈنے کا طریقہ ہی وہ طریقہ ہے جس کی بدولت اسلام ہمیشہ کفر پر غلبہ پاتا رہا ہے۔ مسلمانوں کا یہ طریقہ ایک طرف تو انہیں جہاد نفس کی منزلوں سے گزر کر مصائب کا مقابلہ کرنا سکھاتا ہے۔ اور دوسری طرف خدائے عزوجل کی ذات پر بھروسہ کر کے اپنی قوت عمل کو تیز تر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کا ثبوت تاریخ جا بجا پیش کر رہی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کا واقعہ ملاحظہ ہو۔

روحانیت اور سحر کی معرکہ آرائیاں - مورخین نے لکھا ہے۔ کہ درفش کاویانی یعنی کسریٰ کے جھنڈے پر ۱۰۰ کا نقش تھا۔ یہ نقش اوضاع فلکی کی ساعت سعید میں، جو اس نقش کے لئے نہایت موافق ہے۔ سونے کے بندوں میں کڑھا ہوا تھا۔ ارباب طلسم کا دعویٰ تھا۔ کہ جنگ میں جس طرف سو کا نقش ہو گا۔ اس کی فوج کے پاؤں میدان جنگ سے نہ اکھڑیں گے۔ اور وہ ہمیشہ غالب رہے گی۔ لیکن قادسیہ کی فیصلہ کن جنگ میں کیا ہوتا ہے۔ کہ جب ایران کا سپہ سالار رستم مارا جاتا ہے۔ اور ایرانی فوج بھاگتی ہے تو یہ جھنڈا کچھ کام نہیں دیتا۔ بلکہ فوج کو بھاگتے وقت اس جھنڈے کے سنبھالنے کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ اور وہ بدحواس ہو کر اسے بھی میدان ہی میں چھوڑ جاتی ہے۔ یہ واقعہ ایک طرف تو اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ کہ مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہ اسمائے الٰہی کے آگے سحر بیکار ہو جاتا ہے۔ اور دوسری طرف اس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ مسلمانوں کی روحانیت قوت عمل کو سرد کر دینے کے لئے نہیں تھی۔ کہ وہ صرف اعمال ہی اختیار کئے جائیں اور ہاتھ پیر نہ ہلائیں بلکہ اس لئے تھی۔ کہ ان کے اندر استقلال و ثابت قدمی پیدا ہو۔ اور وہ مخالف کی بڑی سے بڑی طاقت سے نہ گھبرائیں۔

سلب امراض کے اسلامی طریقے ۔ سلب مرض کے طریقے جہاں اور مذہبوں میں پائے جاتے ہیں۔ وہاں اسلام میں بھی ملتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی نہ کفر و الحاد ہے نہ اور خدا ہی سے مدد مانگنے کی شان نظر آتی ہے۔ جس سے مریض بہت متاثر ہوتا ہے۔ اور اسے شفا جلد حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ کسی مرض یا تکلیف کو دور کرنا اس وقت ممکن اور آسان ہے۔ جب عامل کو معمول پر اور مریض کو معالج پر پورا پورا بھروسہ اور اعتقاد ہو۔ چنانچہ اسلامی طرز پر سلب امراض کیلئے جو طریقہ مروج ہے۔ اس میں کلام الٰہی پڑھا جاتا ہے اور کلمات خیر کے ساتھ خدا سے مدد مانگی جاتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کلام الٰہی اور دعا کی پر مریض کو بھی پورا پورا بھروسہ ہوتا ہے اور معالج کو بھی۔ ۔۔۔ تاثیر [illegible] ۔۔۔ اور یہاں ۔۔۔ وہاں ۔۔۔ مثال بنا کر لی۔ منصبی کی بات نہیں ہے۔ اس اصول کی روشنی میں مسلمانوں کے سلب امراض کے طریقوں پر غور کرو تو مذہبی تجربات اور نفسیات کے نقطہ نظر سے کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ بجز اس کے یہی نہیں کہ اسلام نے سلب امراض کیلئے صرف دعا یا نفسی تاثر کو موثر ذریعہ مانا ہے۔ بلکہ دوا اور تدابیر کی افادیت اور اہمیت کو بھی کم نہیں بتایا۔ بلکہ اس سلسلہ میں ایک درمیانی راہ ایک نقطۂ اعتدال اور ایک اوسط امر پیش کیا ہے۔ جسکا مطلب ہے دعا بھی اور دوا بھی۔ اور اس راہ اعتدال کے معقول ہونے میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

نبی اکرمؐ کی شفا بخشی ۔ ذیل میں ہم چند امثال پیش کرتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوگا۔ کہ سلب امراض کے طریقے مسلمانوں میں کتنے کامیاب تھے۔ اور کس موقعہ پر کیا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔

(۱) ایک صحابی جریر بن عبداللہ فرماتے ہیں۔ کہ میری جسمانی حالت اتنی گری ہوئی تھی کہ میں گھوڑے پر اچھی طرح بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے اپنی یہ معذوری کی حالت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی۔ آپ نے میرے سینے پر دست مبارک سے تھپکی دی اور زبان اقدس سے فرمایا۔ اللھم ثبتہ واجعلہ ھادیا مھدیا ۔ اس کے بعد میں اچھی طرح گھوڑے پر سوار ہونے لگا۔ اور مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔

(۲) بعض احادیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا۔ اور اس نے کہا۔ کہ جب سے میں مسلمان ہوا ہوں۔ تب سے میرے بدن میں درد رہتا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ درد کی جگہ پر ہاتھ رکھ کر بسم اللہ تین بار پڑھا کر۔ اور سات بار اعوذ باللہ وقدرتہ من شر ما اجد واحاذر پڑھا کر۔

(۳) جنگ خیبر جب محاصرے نے طول کھینچا تو آنحضرتؐ نے فرمایا۔ کہ علم آور فوج کا سردار میں کل اس شخص کو بناؤں گا جو قلعے کو فتح کر کے رہیگا۔ اور جو خدا اور اس کے رسول کو بہت محبوب ہے۔ دوسرے دن لوگ حضرتؐ کی خدمت میں حاضر تھے۔ اور دل ہی دل میں کہہ رہے تھے کہ دیکھئے یہ سعادت کس کو نصیب ہوتی ہے۔ حضرت رسول خداؐ نے حضرت علیؓ کو یاد فرمایا۔ عرض کیا گیا کہ انہیں آشوب چشم کی ایسی شکایت ہے کہ وہ جنگ میں شرکت سے معذور ہیں۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ کوئی جائے اور انہیں اپنے ساتھ لے آئے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ حضرت علی حاضر ہوئے۔ لیکن آنکھوں میں ایسی تکلیف تھی۔ کہ سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ آنحضرتؐ نے اپنا لعاب دہن حضرت علیؓ کی آنکھوں میں لگایا۔ اور دعا فرمائی۔ حضرت علیؓ کی آنکھیں آن کی آن میں اچھی ہوگئیں۔ گویا انہیں کبھی شکایت ہی نہ تھی۔ چنانچہ حضرت علیؓ کو جھنڈا دیا گیا اور خیبر کا قلعہ آپ کے ہاتھ پر فتح ہوا۔

(۴) حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ازواج مطہرات کو اگر درد کی شکایت ہوتی تھی تو سرور عالمؐ درد کی جگہ دست مبارک رکھ کر یہ دعا پڑھتے تھے۔ اذھب الباس یا رب الناس واشف انت الشافی لا شفاء الا شفاءک لا یغادر سقما

صحابہ کرامؓ کی پیروی ۔ تاریخ و احادیث میں ہمیں اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے۔ کہ سلب امراض صرف آنحضرتؐ ہی نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ آپ کے زمانے میں اور آپ کے بعد صحابہ کرام بھی سلب مرض کیا کرتے تھے۔

(۱) صحیح بخاری میں ایک واقعہ منقول ہے۔ کہ چند صحابی سفر کر رہے تھے۔ ایک بستی میں ان کا گذر ہوا چونکہ بستی والوں نے انہیں اپنا مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔ اتفاقاً اس بستی کے سردار کو سانپ نے کاٹ لیا۔ بستی والوں نے ہر ممکن تدبیر کی لیکن بے سود۔ آخرکار بستی والے حیران و پریشان اصحاب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سب حال سنا کر کہا۔ کہ تم میں سے اگر کوئی تدبیر جانتا ہو تو بتاؤ۔ ایک صحابی نے کہا میں سانپ کے کاٹے کا منتر جانتا ہوں۔ لیکن چونکہ تم لوگوں نے ہمیں یہاں ٹھہرانے سے انکار کیا ہے اس لئے بغیر معاوضہ کے منتر نہیں پڑھوں گا۔ آخر تیس بکریوں پر معاملہ طے ہو گیا۔ وہ صحابی مارگزیدہ سردار کے پاس گئے۔ اور سورہ فاتحہ پڑھ کر کاٹی ہوئی جگہ پر دم کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں وہ شخص بالکل تندرست ہو گیا۔ طے شدہ معاملے کے مطابق بستی والوں نے تیس بکریاں

پیش کر دیں۔

(۲) عبداللہ ایک عالم تھے۔ کہتے ہیں۔ کہ میں سفر میں تھا اور میرا اونٹ بہت تیز اور چالاک تھا۔ اتفاقاً ایک جگہ پر جو اترا تو کسی نے مجھ سے کہا۔ کہ ایک شخص نظر لگانے میں بہت تیز اور مشہور ہے۔ اور چونکہ تمہارا اونٹ بہت اچھا ہے۔ اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ نظر لگا دے۔ اور تمہارا اونٹ ضائع ہو جائے۔ میں نے کہا۔ کہ میرے اونٹ پر اس کی نظر نہیں لگیگی۔ یہ بات اس شخص تک پہنچ بھی گئی۔ اور اس نے اسی وقت آ کر میرے اونٹ کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا۔ اس کے دیکھتے ہی اونٹ گر پڑا اور تڑپنے لگا۔ لوگوں نے مجھ سے بتایا۔ کہ فلاں شخص تمہارے اونٹ کو نظر لگا گیا ہے۔ میں نے اس کو بلوا کر اپنے سامنے بٹھایا۔ اور یہ عمل پڑھا :

بسم اللہ حبس حابس وشجر یابس وشہاب قابس ردوت عین العائن علیہ وعلی احب الناس الیہ فارجع البصر هل ترى من فطور ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئا وھو حسیر۔ چنانچہ جس وقت میں نے اس عمل کو پڑھا اسی وقت اس کی آنکھ نکل پڑی۔ اور میرا اونٹ اچھا ہو گیا۔

اس تمام تفصیل سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اسلام نے روحانی طرز علاج کو زیادہ مؤثر اور معتدل حالت میں پیش کیا ہے۔

علم اسرار الحروف۔ روحانیات میں صحابہ کرام اور پیغمبر اسلام کے بعد صوفیا نے ترقی کی۔ اور اسے درجہ کمال تک پہنچایا۔ عالم میں تصرف کرنا بھی تصوف کا شعبہ ہے۔ چنانچہ عالم میں تصرف کرنے کے لئے صوفیا نے علم اسرار الحروف کے نام سے اپنی روحانی قوت کے مطابق ایک نیا فن نکالا تھا۔ ابن خلدون کی تحریر کے مطابق، یہ علم مسلمانوں میں اس وقت ظاہر ہوا۔ جب اسلاف کا زمانہ گزر گیا۔ بوتی ولبنی العربی کی اس فن میں بہت سی تالیفات ہیں۔ جن کا ماحصل اسمائے حسنیٰ اور کلمات الٰہیہ کے ذریعے جن میں کہ اسرار حروف شامل ہیں۔ عالم طبیعیات میں تصرف کرنا ہے۔ صوفیوں میں اختلاف ہے۔ کہ یہ تصرف حروف کے مزاجوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یا کسی اور سبب سے۔ ایک فرقہ حروف کے مزاجوں کی تاثیر اور تصرف کا قائل ہے۔ اور جس طرح عناصر کی چار قسمیں ہیں۔ اسی طرح وہ حروف کی بھی چار قسمیں کرتا ہے۔ اور حرارت و برودت اور رطوبت و یبوست میں سے ہر ایک کیفیت کو خاص حروف کے ساتھ مختص کرتا ہے۔ اور یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ کہ ان حروف کی طبیعیہ فعلیہ یا انفعالیہ اپنا اثر کرتی ہے۔ بذات خود یہ حروف اثر انداز نہیں ہوتے۔ اس طرح آبی، خاکی، بادی اور آتشی چار قسم کے حروف مقرر و مفروض ہیں۔ چنانچہ آتشی حروف امراض باردہ کو دفع کرتے اور قوت حرارت کو بڑھاتے ہیں۔ اور حروف آبی امراض حارہ یعنی تپ وغیرہ کو دفع کرتے اور قوت برودت بڑھاتے ہیں۔ دوسرا فرقہ اس بات کا قائل ہے کہ حروف اپنی نسبت عددی کی وجہ سے اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔

اذکار و اشتغال۔ صوفیائے کرام نے اذکار و اشتغال کے جو طریقے مقرر کئے۔ ان کی مزاولت سے انسان میں ایسی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن سے مریضوں کو اچھا کر سکنا تو معمولی بات ہے۔ انسان بڑے بڑے خارق عادت کام کر سکتا ہے۔ یہ اسلام ہی کی تعلیمات ہیں جیسا کہ ہمیں نظر آتی ہے۔ کہ سائنٹیفک تحقیقات کے باوجود ان کی تردید نہیں کی جا سکتی۔ ان اشغال و اعمال سے سالک کی قوت ارادی اس قدر بڑھتی ہے۔ کہ ... کا مظہر بن جاتا ہے۔ اور سلب امراض اس کے لئے ایک معمولی بات رہ جاتی ہے۔ بقول مولانا روم علیہ الرحمۃ ؎

اگر ز ابرص چہ باشد مردہ نیز ۔۔۔ زندہ گردد از فسون آں عزیز

طب اسلامی کا نقطہ نظر۔ مذہبی تعلیمات اور تصوف و روحانیت کے تذکرے سے ہٹ کر اب ہم اس طب کا جائزہ لیتے ہیں۔ جو اسلام کے دور عروج میں عروج کو پہنچی اور جس کی بنیادوں کو اسلامی اطباء نے مضبوط بنایا۔ چنانچہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ آیا اس میں بھی روحانی طریق علاج کو کچھ دخل ہے یا نہیں۔

اس مقصد کے لئے جب ہم بنیادی طبی تالیفات کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ طب کی جو تالیفات بنیادی تالیفات کہلانے کا حق رکھتی ہیں۔ ان میں اس قسم کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ جسے سحر یا افسوں اور ٹونے ٹوٹکوں سے کوئی علاقہ ہو۔ بلکہ ان کا فلسفہ مرض و نظریہ علاج مشاہدات اور اصولوں کے سوا کسی خیالی چیز کو چھوتا بھی نہیں۔

نقطۂ اعتدال۔ اسلام میں سلب امراض کے کیا نظریات تھے۔ اور ان کا تجزیہ کرنے سے نفسیات کی جدید تحقیق کس طرح یہ ثابت کرتی ہے۔ کہ یہ طریقے اصولی اعتبار سے صحیح اور درست تھے۔ اس کے متعلق سطور بالا میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اسلام نے ضعیف الاعتقادی اور کمزور خیالات کی بجائے محکم مذہبی تصورات کی جو بنیاد قائم کی ہے وہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اسلام امراض کی پیدائش اور ان کے ازالے کے سلسلہ میں کسی ایسے عمل کی طرف اشارہ نہیں کرتا جس کی توجیہ معقولات میں سے نہ ہو۔ بلکہ وہ اس بارہ میں ایک ایسا نقطۂ اعتدال پیش کرتا ہے جو ہر

اقتباس سے تو بلاشبہ ثابت ہے۔ ظہور اسلام سے پیشتر جن مذموم رسوم کا رواج تھا۔ اسلام کی نمود نے انہیں جہاں انسانی زندگی کے اور معاملات سے ختم کر دیا۔ وہاں علاج معالجے کے سلسلہ میں بھی ان کی خوب اصلاح کر دی۔ اگرچہ اسلام روحانی بیماریوں کا علاج ہی کرنے آیا تھا اور پیغمبر اسلام کی جسمانی علاج کی تعلیم و تبلیغ کے لیئے تشریف نہیں لائے تھے۔ لیکن ان کی نگاہ دور رس نگاہ نے مسلمانوں پر علم طب اور علم حفظ صحت کی اہمیت کو واضح فرما دیا۔ دنیا کے اور تقریباً تمام مذاہب طب اور فن علاج کو الہامی قرار دیتے ہیں۔ لیکن اسلام اس قسم کے تصورات کا بہت کم قائل ہے۔ اسی لئے اکثر حکماء و علماء اسلام اس کا ماخذ قیاس تجربہ کو قرار دیتے ہیں۔ علامہ ابن خلدون نے اس نظریہ کی حمایت میں کہ اسلام طب کو الہامی درجہ نہیں دیتا ہے۔ ایک حدیث پیش کی ہے۔ ان کان الشئی من امر دنیا کم فانتم اعلم بہ وان کان من امور دینکم فالی۔ یعنی جب کوئی دنیوی امر درپیش ہو تو اس کی نسبت تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ اور جب کوئی دینی کام ہو۔ تو اس کے بارے میں میں تم سے بہتر جانتا ہوں۔"

حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ حدیث ایسی جامع اور نادر حدیث ہے کہ اس کی موجودگی میں طب اور دیگر دنیاوی علوم کے متعلق کوئی شبہ ہی باقی نہیں رہتا۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے اکثر مریضوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ حارث ابن کلدہ کے پاس علاج کے لئے جائیں۔ جو آپ کا ہمعصر اور بہت اچھا طبیب تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سدباب امراض کے سلسلہ میں محض روحانیت کے قائل نہ تھے۔ علاوہ ازیں الطب نبوی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ آنحضرت ضرور متعدد دوائیں بھی بتایا کرتے تھے۔ چنانچہ احادیث میں شہد، شیر شتر، ایلوا، سونٹھ، نمک، شبرم اور سنا وغیرہ کے متعلق اکثر تذکرے پائے جاتے ہیں۔ پھر اس سے زیادہ واضح ارشاد ہے۔ جس میں آپ نے علم الابدان اور علم الادیان کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اور علم الابدان پھر علم الادیان پر مقدم رکھ کر طب اور حفظ صحت کی ضرورت کی طرف انسانوں کی توجہ مبذول کی ہے۔

بہرحال اسلام کا نظریہ طب و علاج معلوم کرنے اور روحانی اور دوائی طریق علاج اختیار کرنے یا نہ کرنے کے متعلق اس کے تصورات کا اندازہ لگانے میں کچھ دشواری پیش نہیں آتی اور آسانی سے یہ بات ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ اسلام کسی قسم کی ضعیف الاعتقادی کا حامی نہیں ہے۔ جب خود پیغمبر اسلام کی یہ حالت ہے۔ کہ وہ ازالہ مرض کے لیئے دعا اور دوا دونوں میں اعتدال کی تلقین فرماتے ہیں۔ تو ان محققین کا حال ظاہر ہے۔ جو اسلام سے مشرف ہو کر مشاہدات اور مظاہر فطرت کی روشنی میں طب کی تدوین کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اسلامی اطباء کی تالیفات کا جائزہ لینے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ وہ سائنٹیفک اصولوں کے حامی تھے اور خیالی اور وہمی امور سے انتہائی گریز کرتے تھے۔ کہ ان کی کسی تالیف میں بھی کوئی چیز ایسی نہیں ملتی۔ جو قابل گرفت ہو۔ ان تالیفات میں صحیح اور بنیادی توجیہات کی کوشش نظر آئے گی۔ لیکن سحر افسوں اور ٹونوں ٹوٹکوں کا ذکر کہیں نہیں ملیگا تذکرہ داؤد انطاکی میں طب سحر افسوں، نجوم، جفر، رمل اور کیمیا وغیرہ کا بیان ہے۔ لیکن کسی اور تالیف میں نہیں ہے۔ تذکرہ نویں دسویں صدی ہجری کی تالیفات میں سے ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جسے طب اسلامی کا آخری دور کہا جاتا ہے۔ اور جس میں کہن سالی کی وجہ سے اس کے تار و پود مدھم پڑنے شروع ہو چکے تھے۔ لیکن اس قسم کی تالیف کی کوئی خاص اہمیت اسلامی طب کی زندگی میں نہیں ہے۔ اور اسے شاذ و نادر کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

تدبیر نفسی ۔ اب سوال یہ ہے کہ قدیم اطباء کیا ان حقائق کو بالکل نظر انداز کرتے تھے۔ جن کا تعلق ازالہ امراض کے سلسلہ میں نفسیاتی تاثیر و تاثر سے ہے۔ اور کیا وہ صرف دوائی اور بدنی آثار و تغیرات کے قائل تھے۔ اور نفسیاتی اسباب سے ناواقف تھے۔ اس کا جواب ہمیں تاریخ اور قدیم مستند اکابر کی تالیفات سے یہ ملتا ہے کہ وہ اکثر و بیشتر مواقع پر نفسیاتی علاج سے کام لیا کرتے تھے۔ البتہ یہ ہاں اگرچہ تنویم توجہ اور خود توجہی جیسی جدید اصطلاحیں تو نہ تھیں لیکن ان کا طریق کار وہی تھا جو آجکل کے ماہر نفسیات کا ہے۔ اور ان کے نظریات کی اصل بھی مشاہدات اور مظاہر تھے۔ جن کو بعد کے محققین نے مدون کر کے ایک باضابطہ شکل دے دی ہے۔

ذیل کی مثالوں اور حکایات سے ثابت ہوگا۔ کہ اطباء اسلام تدبیر نفسی پر کس طرح عمل کیا کرتے تھے۔ اور نفسیاتی اور توجہی علاج کو بھی زیر مشق رکھتے تھے:۔

۱۔ **حکایت جبرائیل** ۔ جبرائیل بن بختیشوع اپنے وقت کا بے مثل طبیب و فیلسوف تھا۔ اور خلفائے عباسیہ میں سے دو جلیل القدر خلفاء رشید و امین کا طبیب خاص رہا ہے۔ اس کی دربار رسی کا ذریعہ ایک ایسے واقعہ کو قرار دیا جاتا ہے۔ جو خالص نفسیاتی نوعیت کا ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ بہت مشہور ہے۔ کہ ہارون رشید کی ایک کنیز کا ہاتھ کسی وجہ سے اکڑ کر رہ گیا تھا۔ اور اس میں حس و حرکت نہ ہوتی تھی۔ تمام درباری طبیب علاج کرتے کرتے تھک گئے۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر ایک دن رشید نے وزیر جعفر برمکی سے کہا۔ جعفر! کیا یہ مرض

اب یوں ہی رہے گی۔ اس کا کچھ علاج ہونا چاہیئے" جعفر نے کہا۔ کہ اس کا علاج جبرئیل سے کرایا جائے۔ بالآخر جعفر برمکی کی تجویز کے مطابق، جبرئیل بن بختیشوع کو بلایا گیا۔ جبرئیل نے خلیفۃ المسلمین سے کہا۔ اگر حضور ناخوش نہ ہوں تو میں کچھ عرض کر سکتا ہوں۔ ہارون رشید نے اجازت دی۔ جبرئیل نے مریضہ کو سامنے بلوانے کے لیئے کہا۔ جب وہ کنیز مجلس میں آئی تو جبرئیل نے بڑھ کر بڑی بے تکلفی سے اس کے کمر بند پر ہاتھ ڈالا۔ اور یہ ارادہ ظاہر کیا۔ کہ گویا اس کو برہنہ کر ڈالیگا۔ کنیز پر غیرت اور شرم اتنی غالب آئی کہ وہ پسینہ پسینہ ہوگئی۔ اور اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے کمر بند پکڑ لیا۔ جبرئیل نے ہارون رشید سے کہا۔ کہ مریضہ اچھی ہوگئی۔ خلیفہ نے کنیز کو حکم دیا۔ کہ وہ اپنا ہاتھ ہر طرف پھرائے۔ اب وہ بے تکلف ہاتھ کو نیچے اوپر لے جاتی تھی۔ اور ذرا بھی کسی قسم کی شکایت نہ تھی۔

۲۔ حکایت اوحدالزمان ۔ اوحدالزمان ابی البرکات جو ابن اللہ ابن تمیمیہ کا معاصر تھا۔ اور خلیفہ مستنجد باللہ کی خدمت میں رہا تھا۔ مالیخولیا کا علاج عجیب غریب طریقے سے کیا تھا۔

بغداد میں ایک شخص کو مالیخولیا ہوگیا تھا۔ متعدد علاج معالجے کیئے گئے۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بیمار کے دماغ میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا۔ کہ اس کے سر پر مٹی کا مٹکا رکھا ہے۔ اس خیال سے وہ کبھی کسی دروازے یا نیچی چھت کی عمارت میں جھکے بغیر داخل نہیں ہوتا تھا۔ راستے میں چلتا تو راستہ چلنے والوں سے بچکر چلتا۔ کہیں کسی کا دھکا نہ لگ جائے اور مٹکا گر پڑے۔ یہ وہم اسے نہایت تکلیف دیتا تھا۔ لیکن اس کا ازالہ کسی سے نہیں ہوسکا۔ ابی البرکات نے سوچا۔ کہ وہم کا علاج وہم ہی سے ہوگا۔ اس نے اپنے دو غلاموں کو سمجھا دیا۔ کہ ان میں سے ایک مٹکا لیکر چھت پر ایک مٹی کا مٹکا لے کر جا بیٹھے۔ اور دوسرا لکڑی لئے ہوئے مستعد رہے۔ وہ مریض کو بلا کر صحن میں ایسی جگہ بٹھائیگا۔ جو چھت سے قریب ہو۔ جب اشارہ کرے تو لٹھ بند غلام اس طرح لکڑی گھما کر مارے کہ مریض کے سر پر لگنے نہ لگے۔ مگر کچھ فاصلے سے ہوا میں اس طرح گزرے۔ اور اسی کے ساتھ چھت پر جو غلام ہے۔ وہ مٹی کے مٹکے کو یوں پھینکے۔ کہ مٹکا مریض کے پاس آ کر گرے اور ٹوٹ جائے۔ یہ سب انتظام مکمل کرنے کے بعد اوحدالزمان نے مریض کو اپنے پاس بلوایا۔ اور دیوان خانہ میں چھجہ کے نیچے اسے بٹھا دیا۔ اور خود بھی قریب بیٹھ کر اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ جس وقت اس نے دیکھا کہ مریض اس کی باتوں میں خوب محو ہے۔ بس چپکے سے اشارہ کر دیا۔ اشارہ پاتے ہی نیچے والے غلام نے لکڑی چلائی۔ اور مریض کے سر پر سے لکڑی کا زناٹا بھرتی ہوئی سر سے نکل گئی۔ اور چھت پر جو غلام تھا اس نے فوراً ہی چھت پر سے مٹکا پھینک دیا۔ اس سے مریض کو بالکل یہ یقین ہوگیا۔ کہ جو مٹکا ٹوٹا ہے وہ اس کے سر پر کا مٹکا ہے۔ اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور وہ بالکل اچھا ہوگیا۔

۳۔ حکایت بوعلی سینا ۔ خاندان بویہ کا ایک شہزادہ ایک مرتبہ مالیخولیا میں مبتلا ہوگیا اور اس کے دماغ میں یہ وہم سما گیا۔ کہ وہ گائے بن گیا ہے۔ چنانچہ وہ ہر شخص کے سامنے گائے کی طرح ڈکراتا تھا۔ اور ہر ایک سے کہتا تھا۔ کہ اس کو ذبح کر کے مزیدار ہریسہ پکاؤ۔ اس کا یہ وہم اس حد تک بڑھا۔ کہ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اور اطباء حیران تھے کہ اس کا کیا علاج کریں۔

آخر کار بوعلی سینا سے درخواست کی گئی۔ کہ وہ اس کا علاج کریں۔ اس نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اس درخواست کو منظور کر لیا۔ اور مریض کے پاس پیغام بھجوایا۔ کہ قصاب اس کو ذبح کرنے کیلئے آ رہا ہے۔ جب یہ پیغام مریض کے پاس پہنچا۔ تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد بوعلی ایک تیز چھری لے کر مریض کے گھر میں داخل ہوا۔ اور بولا وہ گائے کہاں ہے۔ میں اس کو ذبح کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ سنکر مریض نے گائے کی طرح ڈکرانا شروع کر دیا تاکہ یہ پتہ چل جائے کہ وہ کہاں ہے۔ ابو علی نے ذبح ہونے والی گائے کی طرح مریض کے ہاتھ پاؤں باندھ کر زمین پر ڈال دیا۔ پھر اس کے جسم کو اچھی طرح ٹٹولنا شروع کیا۔ گویا وہ دیکھ رہا ہے۔ کہ گائے اچھی فربہ ہے یا نہیں۔ آخر ٹٹول ٹٹال کر اس نے مریض سے کہا۔ کہ گائے ابھی ذبح ہونے کے قابل نہیں ہے۔ ذبح کرنے سے پہلے اس کو کھلا پلا کر موٹا تازہ کرنا چاہیئے۔ بوعلی یہ کہہ کر چلا گیا۔ اس کے بعد مریض کے رشتہ داروں نے اس کو بہتر اور مناسب غذائیں کھلائیں۔ اور مریض نے ذبح ہونے کے شوق میں انہیں خوب کھایا۔ لیکن ان ہی غذاؤں کا یہ اثر ہوا کہ مریض میں آہستہ آہستہ قوت پیدا ہوگئی۔ اور اس کا وہم دور ہوگیا۔

۴۔ حکایت جالینوس ۔ ہمارے مقالہ میں حکیم جالینوس کے متعلق بھی ایک حکایت ہے۔ جس سے نفسیاتی علاج پر روشنی پڑتی ہے وہ حکایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ فضل بن یحیٰی برمکی کے سینے پر برص نمودار ہوا۔ اور طبیب موصوف نے اس کا بہت کچھ علاج کیا۔ مگر فائدہ نہ ہوا۔ آخر ایک دن جالینوس نے فضل سے کہا۔ کہ آپ کے والد بزرگوار آپ سے ناراض ہیں۔ اور میری رائے میں ممکن ہے۔ کہ ان کی ناراضی آپ کے علاج کی ناکامی کا باعث بن رہی ہو۔ لہذا آپ اپنے والد صاحب کو خوش کیجیئے۔ فضل نے اپنے

حالانکہ بجلی میں کی سے معافی مانگی۔ اور جس کا علاج دوبارہ شروع کیا۔ جس سے شفا ہو گی۔

۵۔ **حکایت مولانا نظامی گنجوی** ۔ مولانا نظامی گنجوی نے اپنی کتاب مخزن اسرار میں ایک حکایت نظم کی ہے کہ ایک بادشاہ کے دو طبیب تھے۔ جو آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ ان میں سخت مقابلہ ہوا۔ اور معاملہ جنگ کی نوبت آ گئی۔ چنانچہ یہ طے پایا۔ کہ دونوں طبیب اپنے تیار کئے گئے زہر دل کے پیالے ایک دوسرے کو پلائیں۔ اس طرح کہ ہر ایک باری باری سے اپنے مخالف کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ پیئے اور پھر اس کے مہلک اثرات زائل کرنے کیلئے، اس کا مناسب تریاق استعمال کرے۔

مقابلہ شروع ہوا۔ اس فیصلہ کے مطابق پہلے طبیب نے ایک ایسا خطرناک زہر تیار کر کے مخالف کو دیا۔ جس سے سنگ خارا بھی پگھل سکتا تھا۔ لیکن دوسرے نے اس پیالے کو ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ اور پھر اس نے ایک ایسا تریاق استعمال کر لیا۔ جس نے اس کو کوئی نقصان نہ پہنچایا۔ اس کے بعد دوسرے طبیب کی باری آئی۔ اس نے صرف اتنا کیا۔ کہ گلاب کا صرف ایک پھول باغ سے توڑا۔ اور اس پر کچھ پڑھ کر دم کیا۔ اور مخالف سے کہا "تم اس کو صرف سونگھ لو"

چنانچہ اس نے پھول کو سونگھا۔ اور سونگھتے ہی زمین پر گر پڑا۔ اور مر گیا۔ اس پر مولانا گنجوی نے لکھا ہے۔

دشمن از آں گل کہ فسوں خواں بداد   ترس بدو چیرہ شدہ جان بداد

آں بعلاج از تن خود زہر بُرد   ویں بیکے گل ز تو ہم بمُرد

۶۔ **حکایت حضرت امام شہاب الدین سہروردیؒ** ۔ امام سیمیا کے ماہر کامل تھے۔ ان کی حکایتیں ایسی عجیب غریب ہیں۔ کہ سمجھ میں نہیں آتیں۔ ایک دفعہ چند دوستوں اور شاگردوں کے ہمراہ دمشق کے باہر کسی میدان میں جا رہے تھے۔ سیمیا و نیرنگ کا تذکرہ ہوا۔ اور امام کے اس میں ماہر کامل ہونے کا ذکر چھڑ گیا۔ شیخ نے اپنے ہمراہیوں سے مخاطب ہو کر کہا "ذرا دیکھنا دمشق کس قدر خوبصورت اور دلفریب ہے۔" لوگوں نے دیکھا کہ میدان میں ان کے سامنے نہایت شاندار خوشنما عمارتوں کا سلسلہ ہے۔ قصروں میں پائیں باغ ہیں۔ چہار اطراف چھوٹی نہریں جاری ہیں۔ حسین عورتیں دریچوں میں بیٹھی ہیں۔ رقص و سرود کی آواز آ رہی ہے۔ غرض جنت کا نظارہ اور [illegible] کا حال [illegible] نظر آتا تھا۔ [illegible] ایک دم یہ سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اور وہ مبہوت کھڑے رہ گئے۔ جن لوگوں نے یہ تماشا دیکھا تھا۔ وہ حلف اٹھا کر بیان کرتے تھے کہ مدتوں تک اس منظر کی لذت انہیں محسوس ہوتی رہی۔

۷۔ **حکایت** ۔ امام شہاب الدین ایک دفعہ چند معتقدین کی معیت میں جا رہے تھے۔ چند ترکمان گڈریے جو بھیڑوں کا گلہ لئے جا رہے تھے۔ ادھر سے گذرے۔ ایک معتقد نے کہا "اس وقت تو دل چاہتا ہے کہ بھیڑ خرید کر اس کا گوشت کھائیں"۔ امام نے اسے بھیڑ خریدنے کیلئے دس درہم دیئے۔ وہ گیا اور ترکمان سے بھیڑ خرید لایا۔ ابھی وہ کچھ زیادہ دور نہ آیا تھا۔ کہ دوسرا ترکمان دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا جو میرا ساتھی بھیڑ بیچنا نہیں جانتا۔ تم نے اس کی کم قیمت ادا کی ہے۔ اس کو واپس کر کے اس سے چھوٹی بھیڑ لے لو۔ امام کے معتقد کے انکار کرنے پر ترکمان لڑنے مرنے کو تیار ہو گیا۔ اتنے میں امام بھی آ گئے۔ لیکن ان کے سمجھانے پر بھی ترکمان نہ مانا۔ تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ کہ بھیڑ لے کر چلے جائیں اور خود ترکمان سے باتیں کرنے لگے۔ جب ان کے ساتھی کافی دور چلے گئے۔ تو امام بھی اسے چھوڑ کر چلے ترکمان ان کے پیچھے دوڑا۔ امام بھاگے۔ ترکمان نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور زور سے کھینچا۔ امام کا ہاتھ شانہ سے الگ ہو کر ترکمان کے ہاتھ میں رہ گیا۔ اور یہ بھاگے چلے گئے۔ خون برابر بہہ رہا تھا۔ ترکمان اس قدر خوفزدہ ہوا کہ مزید ایک قدم بھی پیچھا نہ کر سکا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ان کا ہاتھ پھینک دیا۔ اور خود بھاگ کر اپنے ہمراہیوں کے پاس چلا گیا۔ امام نے ہاتھ اٹھا لیا۔ اور معتقدوں کے پاس چلے آئے۔ انہوں نے دیکھا۔ کہ امام کے جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اور ان کے ہاتھ میں صرف ایک رومال ہے۔

۸۔ **شیخ کمال الدین بن یونسؒ** ۔ اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم اور فاضل یگانہ اور سر آمد حکما تھے۔ ایک بار انہیں امیر بدرالدین لولو والئے موصل سے کچھ کام تھا۔ امیر ہر صبح تیز رو گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کیلئے جایا کرتا۔ اس روز حسب معمول اسپ خاصہ لایا گیا۔ امیر سوار ہو گیا۔ لیکن تمام کوششوں کے باوجود گھوڑے نے قدم نہ اٹھایا۔ اسے چھوڑ کر دوسرا گھوڑا منگایا۔ تو اس کی بھی یہی حالت ہوئی۔ امیر حیران تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ اتنے میں شیخ آ گئے۔ انہوں نے جو کہنا تھا۔ کہا سنا۔ امیر نے ان کے ارشاد کی تعمیل کر دی پھر کہا۔ "اب سمجھ میں آیا۔ آپ آ رہے تھے۔ اسلئے میرا گھوڑا بھی چلتا نہ تھا۔" شیخ نے مسکرا کر کہا یہ فقیروں کی دعا ہے۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ اندازہ ہوتا ہے۔ کہ اسلامی اطباء اس میدان میں کس حد تک سائنٹیفک طریقوں سے کام لیتے تھے۔ اور یہ بھی کہ نفس انسانی کی کہنہ حقیقت ان کو بخوبی طرح معلوم تھی۔ پانچویں مکاشفہ میں بھی دانا نظامی گنجوی نے اپنے پیارے مصرعوں میں اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ کہ طبیب کی موت کا سبب پھول کا سونگھنا یا کوئی اور افسوں نہیں تھا۔ بلکہ ترس اور خوف تھا۔ اور وہ محض توہم یا تاثر نفسی کی وجہ سے مرا۔ اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے +

تنویم اور نفسیاتی علاج کی جدید تاریخ

یورپ کے عہد تاریک میں (سنہ ۲۰۰ سے سنہ ۱۲۰۰ تک) طب بتدریج توہمات میں گم ہو گئی۔ حتیٰ کہ چھٹی صدی تک طب یونان بھی بے نام و نشان ہو گئی تھی۔ ابتدا میں کفار کے مندروں میں کم و بیش طبی اصولوں پر مریضوں کا علاج ہوتا رہا۔ ساتویں صدی تک یہ مندر بھی تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ اور یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ تاہم ان کی جگہ کسی حد تک کلیساؤں اور خانقاہوں نے لے لی۔ راہب اور پادری خدمت خلق کیلئے مریضوں کا تھوڑا بہت علاج کرتے رہے۔ گیارھویں صدی میں سینٹ برنرڈ نے اسے بھی روک دیا اور دوا کی بجائے امراض کا علاج صرف دعا تک محدود ہو کر رہ گیا۔ غرض اس عہد میں یورپ میں یہ ہوا کہ مذہبیت کے عام تسلط کے باعث ہر علم نے رجعت قہقری اختیار کی اور ہر قسم کا تمدن اوہام و مذہب کے پنجے میں پھنس گیا۔ جب مغرب کا یہ حال تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اوج کمال پر تھا۔ نویں دسویں صدی سے تیرھویں چودھویں صدی تک اسلامیوں نے یورپ کو مختلف ذرائع سے متاثر کیا۔ اور علم و حکمت کا درس دیا۔ جس کے نتیجہ میں قرون متوسطہ کے خاتمہ کے بعد یورپ میں نشاۃ الثانیہ (Rennaisance) کا آغاز ہوا۔ اور علوم و فنون از سر نو ترقی کرنے لگے۔

حیوانی مقناطیسیت کے پہلے نقیب۔ اس زمانہ میں جادو ٹونے وغیرہ کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا۔ کہ یہ اجرام فلکی کے تحت اثر ہوتے ہیں۔ پیکیوٹرا نے ۱۵۳۰ء میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ستارے انسان کو عموماً اور امراض کو خصوصاً متاثر کرتے ہیں۔ بعد ازاں اس نظریے کو یوں وسعت حاصل ہوئی کہ صرف ستارے ہی انسانوں کو متاثر نہیں کرتے۔ انسان خود بھی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ چنانچہ وان ہیلمنٹ نے وضاحت سے بتایا۔ کہ انسان میں ایک قسم کی مقناطیسی قوت ہوتی ہے۔ جس سے وہ دوسرے انسانوں اور بالخصوص مریضوں کو متاثر کرتا ہے۔ غرض سترھویں صدی میں حیوانی مقناطیسیت (Animal Magnetism) اور شفا بخشی کی شخصی طاقت کے متعلق چند در چند عقائد و اعمال موجود تھے۔ اس وقت یہ خیال عام تھا کہ مقناطیسیت ایسی قوت ہے۔ جو انسان پر اثر کر سکتی ہے۔ اور علاج میں مستعمل ہو سکتی ہے۔ ۱۶۰۸ء میں ماربرگ کے ماہر طبیعیات روڈولف گوکلینیوس (Rudolph Goclenius) نے زخموں کے مقناطیسی علاج کے متعلق باقاعدہ ایک کتاب لکھی۔ ۱۶۴۳ء میں اتھاناسیوس کرخر (Athanasius Kircher) نے مقناطیسیت کی شفا بخشی کا وضاحت سے ذکر کیا۔ ۱۶۶۵ء میں سکاٹش میکسول نے یہ نظریہ پیش کیا۔ کہ انسان کے جسم سے ایک طرح کی شعاعیں خارج ہوتی ہیں۔ جو روح حیوانی سے حاصل ہوتی ہیں۔ اسی سے روح اپنے افعال سرانجام دیتی ہے۔ اس کے خیال کے مطابق کائنات میں ایک روح حیوانی ہوتی ہے۔ جو اجسام کو ایک دوسرے سے متعلق کرتی ہے۔

شفا بخشی کی شخصی قوت۔ مقناطیسیت کی طرح شفا بخشی کی شخصی قوت کا خیال بھی بہت قدیم ہے۔ اس کی مثالیں قدیم تاریخ میں بڑی کثرت سے ملتی ہیں۔ یہ عقیدہ عام تھا۔ کہ یہ قوت خاص خاص اشخاص اور بالخصوص حکمرانوں کو ودیعت کی جاتی ہے۔ شاہان انگلستان بالخصوص چارلس نے اس کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ مریضوں کو صحت بخشنے کیلئے انہیں چھوتا تھا۔ اس قوت کو استعمال کرنے کے بعض مدعی مریضوں کو تھپکتے تھے۔ تنویم میں بھی اس سے ملتا جلتا عمل کیا جاتا ہے۔

حیوانی مقناطیسیت مسمر سے قبل۔ فریڈرائینٹن مسمر (Fredraneten Mesmer) کے متعلق خیال کیا جاتا ہے۔ کہ وہ مقناطیسیت کے نظریہ کا بانی تھا۔ اور سب سے پہلے اس نے حیوانی مقناطیسیت کو عملی صورت میں برتا۔ اس لئے مسمر ازم اور حیوانی مقناطیسیت لازم و ملزوم سے ہو گئے ہیں۔ یہ خیال عام ہونے کے باوجود غلط ہے۔ کیونکہ مسمر نہ حیوانی مقناطیسیت کا بانی تھا نہ اس نے سب سے پہلے اس سے کام لیا۔ حتیٰ کہ اس کا طریق کار بھی اپنی ایجاد نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ صحیح ہے۔ کہ اس نے یورپ میں حیوانی مقناطیسیت

کو مرویج کر کے شہرت عام حاصل کی۔ ورنہ حیوانی مقناطیسیت کا خیال بہت قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے۔ اور یورپ میں مسمر سے قبل ہی موجود تھا۔

مسمر [illegible] جس کے نام سے مسمرازم منسوب ہوا۔ ایک معمولی گھرانے میں ۲۳ مئی ۱۷۳۴ء کو ازننگ میں پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی زندگی کے حالات گمنامی کے پردے میں مستور ہیں۔ ۱۷۶۶ء میں اس نے ویانا یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں اس نے انسانوں اور ان کی صحت پر سیاروں کے اثرات کا بغور مطالعہ شروع کیا۔ اس کے عہد میں یہ خیال یورپ میں بہت عام تھا۔

مسمر کے ماخذ ۔ مسمر نے حیوانی مقناطیسیت کا نظریہ اپنے پیشروؤں اور معصروں کے خیالات اور نظریات سے لیا۔ اور اسلامی تصوف سے براہ راست اخذ کیا۔ حاجی تمدش یکتاشی ہنگری کے ایک صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ ان کے حلقہ ارادت میں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے عیسائی بھی شامل تھے۔ ہنگری کے فوجیوں کو ان سے خاص عقیدت تھی اور ان کا اعتقاد تھا۔ کہ جو سپاہی حاجی صاحب کا تعویذ اپنے بازو پر باندھ لیتا ہے۔ اس پر بندوق کی گولی اپنا اثر نہیں کرتی۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا۔ کہ حاجی صاحب سنگینوں تلواروں اور گولیوں کے زخموں کو صرف ہاتھ پھیر کر اور لعاب دہن لگا کر اچھا کر لیتے ہیں۔

ان واقعات کی تصدیق ڈاکٹر زدیمر کی تحریر سے بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ حاجی صاحب کے حالات سپرد قلم کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ جب حاجی صاحب کے سامنے کوئی مریض لایا جاتا تھا۔ تو وہ اس پر کچھ دعائیں پڑھ کر دم کر دیتے تھے۔ اور اسے چت لٹا کر اس پر اپنے ہاتھ پھیرتے تھے۔ اور اس طرح مریض کو صحت ہو جاتی تھی۔ یہ بات مشہور ہے کہ حاجی صاحب اکثر اپنے چہرے پر نقاب ڈالے رہتے تھے۔ کیونکہ وہ جس شخص کی طرف گھور کر دیکھتے تھے۔ وہ بے ہوش ہو جاتا تھا۔

اب یہ تاریخی حقیقت سامنے رکھنے پر کہ اٹھارویں صدی کے وسط میں حاجی تمدش یکتاشی کے فیضان روحانی کے مظاہرے عام تھے۔ اور ان کی ہستی مرجع انام بنی ہوئی تھی۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ ڈاکٹر مسمر نے حیوانی مقناطیسیت کا نظریہ نقرائے اسلام اور صوفیائے کرام کے علم بے پایاں میں سے بھیک کے طور پر مانگا ہے۔ کیونکہ مسمر کی شہرت اور ترقی اٹھارویں صدی کے آخر میں ہوئی تھی۔ اور اس سے پیشتر بہت سے صاحب کشف و کرامت بزرگ روحانی فیض کا مظاہرہ کر چکے تھے۔

مقناطیسیت کے انکشاف یا ایجاد کا سہرا ڈاکٹر مسمر کے سر باندھنے والوں کے مقابلے میں اور بھی بہت سے تاریخی شواہد موجود ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسمر نے یہ نظریہ اپنے معاصرین سے اخذ کیا تھا۔ چنانچہ مسمر کا ایک ہمعصر گاگنی تھا۔ یہ ایک مشہور سیاح تھا۔ اور تنویم پیدا کرنے کے طریقوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ جون ہگی نے لکھا ہے کہ اس سیاح نے تنویم کے طریقے مشرق کے فقیروں اور درویشوں سے سیکھے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی ایسی شہادتیں موجود ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یورپ میں سیاح لوگ ایسے طریقے مشرق اور دوسرے مقامات سے حاصل کر کے پہنچتے تھے۔ اور اس طرح مسمر سے قبل اور اس کے زمانہ میں بھی یورپ کے اندر تنویم اور حیوانی مقناطیسیت کے خیالات موجود تھے۔ اور ان کو مسمر نے پیش نہیں کیا۔ بلکہ اس نے مختلف طریقوں سے ان کی تبلیغ خوب کی ہے۔ ۱۷۷۸ء کے لگ بھگ اس نے اس عقیدہ کی تشہیر شروع کی۔ کہ سورج چاند اور دوسرے اجرام فلکی ایک دوسرے پر خاص اثر رکھتے ہیں۔ ان کا ملا جلا اثر ساری کائنات پر پڑتا ہے۔ اس سے نہ صرف سمندروں میں مد و جزر پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ تمام موجودات بھی ان کی زد میں آتے ہیں۔ مسمر انسانوں پر بالخصوص اجرام فلکی کے اثر کا قائل تھا۔ اس کا اعتقاد تھا۔ کہ سیاروں کے اثر کے تحت انسانوں کی تاثیر میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی کوئی نیا نظریہ نہ تھا۔ بلکہ طب اسلامی اور طب یونانی میں اس قسم کے بیشتر نظریات پہلے سے موجود تھے۔ مسمر کے حیوانی مقناطیسیت کے نظریہ کو جن واقعات نے پختگی دی۔ ان میں سے ذیل کا واقعہ اہم ہے۔

ابتدائی تجربات ۔ مسمر کو ایک زخمی دیکھنا پڑا۔ جس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ جب وہ مریض کے قریب جاتا ہے تو خون کے بہنے میں کمی ہو جاتی ہے۔ اس تجربہ سے اسے یقین کامل ہو گیا۔ کہ انسان کے جسم میں ایک خاص قسم کی قوت ہے۔ جس کا اثر دوسرے انسانوں پر ہوتا ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد مسمر سنگ مقناطیس سے مریضوں پر تجربے کرنے لگا۔ اکثر عصبی امراض کے مریضوں پر وہ ان کے ذریعے اثرات ڈال کر علاج کیا کرتا۔ ۱۷۷۵ء میں اس نے علمی مجلسوں کو ایک مراسلہ لکھا۔ اس میں حیوانی مقناطیسیت کی وکالت کی گئی تھی۔ جس سے انسان ایک دوسرے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس نے حیوانی مقناطیسیت اور معدنی مقناطیسیت کا تفاوت بھی بیان کیا۔ لیکن برلن کی ایک علمی مجلس کے سوا کسی نے جواب کی زحمت گوارہ نہ کی۔ بدقسمتی سے یہ جواب واحد بھی اس کے حق میں نہ تھا۔ بعد میں مسمر کو یہ یقین ہو گیا کہ حیوانی مقناطیسیت پر قوت ارادی کا زبردست اثر پڑتا ہے۔ معدنی مقناطیسیت کا استعمال اس نے بے فائدہ سمجھ کر ترک کر دیا۔ اور "پاس" کا طریقہ نکالا۔ ایک بہرے لڑکے کی قوت سامعہ درست کر کے اس نے خاصی شہرت حاصل کر لی۔ علاج کے دوران میں وہ ہاتھ میں ایک مقناطیسی سلاخ

بھی رکھتا تھا۔ اور مریض پر "پاس" کرنے کیلئے کبھی کبھی اسے بھی استعمال کرتا تھا۔ ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے مسمر مریضوں کو علاج کے لئے دوائیں مقناکر (میگنیٹائز کرکے) بھی دیا کرتا تھا۔ لیکن بالعموم وہ علاج اپنے خاص طریق پر بلا دوا ہی کیا کرتا۔ اُس کا عقیدہ تھا۔ کہ انتہائی حالت یا تشنج شفا کا ضروری حصہ ہے۔

مسمر فرانس میں ۔ ویانا میں مسمر کے طریق علاج کے بہت سے مخالف پیدا ہوگئے۔ ان میں سے بعض اُس کے سخت دشمن بن گئے۔ ان سے نجات حاصل کرنے کیلئے ۱۷۷۸ء میں اُس نے ویانا کو چھوڑا۔ اور سوئٹزرلینڈ کے راستے فرانس کے دارالحکومت پیرس میں وارد ہو گیا۔ یہاں اُس نے مقناطیسیت کے مختلف تجربات کئے اور اس امر کا ادعا کیا۔ کہ حیوانی مقناطیسیت انسانوں اور حیوانوں کے علاوہ مادی اشیاء لکڑی، لوہے، شیشے وغیرہ پر بھی کما حقہ اثر انداز ہوسکتی ہے۔ اس خیال کے پیش نظر اُس نے لکڑی کی صندوقچی بنوائی۔ اس کے متعلق خیال تھا۔ کہ مسمر اس میں اپنی مقناطیسیت کو داخل کر دیتا ہے۔ یہ اس کی مقناطیسیت کا ایک واسطہ ہے۔ جس کے ذریعے اس کی مقناطیسیت [illegible] ہوتی تھیں۔

مسمر کی پیرس میں کارگزاری ۔ پیرس میں شروع شروع میں اس کی تضحیک کی گئی۔ اور اس کے طریق علاج پر پھبتیاں کسی گئیں۔ لیکن جلد ہی اُس نے اپنے معتقدوں اور مداحوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا کر لیا۔ ۱۷۷۸ء میں مُسمر ملکہ میری اینٹوئینیٹ کی شاہی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ اور مریضوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ اُس کیلئے فرداً فرداً ہر مریض پر اثر ڈالنا دوبھر ہوگیا۔ اس دقت کو رفع کرنے کے لئے اُس نے چار فٹ چوڑے پیندے کا ایک ٹب بنوایا۔ جس کے درمیان "مقناطیسی ہوئے پانی کی چند بوتلیں سربند کرکے رکھ دیتا تھا۔ اس ٹب میں پانی بھر دیا جاتا۔ اور اس پر پاس کرکے پانی کو مقناطیس دیتا تھا۔ ٹب کو لوہے کے سرپوش سے جس میں بہت سے سوراخ ہوتے تھے۔ ڈھک دیا جاتا۔ ان سوراخوں میں لوہے کی مقناطیسی تاریں ڈال دی جاتیں۔ خود مسمر زرد رنگ کی مشرقی طرز کی پوشاک پہن لیتا۔ اور ہاتھ میں لکڑی کا چھوٹا سا مقناطیسی رول رکھتا تھا۔ مریض ٹب کے ارد گرد حلقہ دار بیٹھ جاتے تھے۔ اور مقناطیسی تاروں کو جسم کے مختلف حصوں کے مقامات مرض پر لگاتے تھے۔ مسمر اور اس کے رفیق جنہیں اس نے اپنے طریق علاج کی تربیت دی تھی۔ مریضوں کے سر پر "پاس" کرتے اور اپنا ہاتھ سے مریضوں کی پیشانی یا مقام تکلیف کو چھوتے تھے۔ یہ عمل ایک دھندلی روشنی والے کمرے میں ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ مدہم سُروں میں باجہ بجتا رہتا۔ ان تمام امور سے مریضوں پر انتہائی حالت طاری ہوجاتی۔ کوئی سو جاتا۔ کوئی بیہوش ہوجاتا۔ کوئی سخت گرمی محسوس کرتا اور پسینہ پسینہ ہوجاتا۔ کوئی شدید سردی محسوس کرتا اور ٹھٹھرنے لگتا۔ بعض اس قسم کی سنسنی محسوس کرتے اور خاموش بیٹھے رہتے۔ کئی مریضوں پر تشنج کے سے دورے پڑتے۔ کچھ بے اختیار ہنسنے یا رونے لگتے۔ غرض طبیعت کے اقتضاء کے مطابق ہر مریض کم و بیش اثر محسوس کرتا تھا۔ مسمر کے اعمال کا نظارہ کرنے کیلئے ہر درجہ اور طبقہ کے لوگ آتے تھے۔ جن میں کوئی شانز و ہم کے دربار کے امراء اور ان کی بیگمات بھی شامل تھیں۔ مورخ تبیی نے اپنے چشمدید حالات ان الفاظ میں بیان کئے ہیں۔

"مریض کثرت سے مسمر کے پاس جاتے جہاں انہیں قطاروں میں ٹب کے ارد گرد بٹھا دیا جاتا۔ وہ اپنے امراض کو دور کرنے کیلئے ہر طریق سے مقناطیسیت حاصل کرتے۔ ٹب کے آہنی سرپوش کے سوراخوں سے جو مقناطیسی تاریں نکلتیں۔ انہیں مقام مرض پر لگاتے یا اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیتے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا جاتا۔ تاکہ یہ قوت سب میں مساوی طور پر تقسیم ہوجائے۔ خاموشی اور عقیدت کے عالم میں پیانو کی دلفریب آواز سے عجیب سماں پیدا ہوجاتا۔ مسمر اور اس کے رفیق مریضوں پر "پاس" بھی کرتے تھے۔ ہاتھوں اور انگلیوں کو مختلف شکلوں میں گھماتے، بغیر آنکھ جھپکے، چہرے اور مقام مرض کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے۔ انگوٹھے سے بعض اوقات پر ہلکا سا دباؤ ڈالتے اس سے مریضوں میں مختلف کیفیات پیدا ہونے لگتیں۔ کسی کو کھانسی ہونے لگتی۔ کسی کے منہ سے رال بہنے لگتی۔ بعض جسم کے مختلف حصوں میں تندی محسوس کرتے یا پسینہ سے تر بتر ہوجاتے۔ کوئی اونگھنے لگتا اور کوئی گہری نیند سو جاتا۔ ایسے بھی مریض تھے۔ جو کوشش کے باوجود کوئی اثر محسوس نہ کر سکتے۔ کچھ مریضوں کو تشنج کے دورے پڑ جاتے تھے۔ جنہیں دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی۔ جس شخص نے عمل ہوتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔ وہ اس کے متعلق اندازہ نہیں کر سکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ مریض پر خواہ کوئی کیفیت طاری ہو۔ خواہ گہری نیند سو رہا ہو یا اس پر تشنج کا دورہ پڑا ہو۔ وہ ہر حال میں پوری طرح عامل کے احکام و اختیار میں ہوتا تھا۔ اور عامل کی معمولی سعی سے پہلی حالت میں لوٹ آتا تھا۔"

مخالفت، موافقت اور تحقیقات ۔ مسمر کے تجربات نے دھوم مچا دی ۔ ساتھ ہی اس کی مخالفت میں ڈاکٹروں اور پادریوں نے سخت شدت اختیار کر لی ۔ اسے دھوکہ باز، مکار اور ساحر جیسے الفاظ سے یاد کیا گیا ۔ اور عوام کو اس سے بچنے کی تلقین کی گئی ۔ شعراء نے مذاحیہ نظمیں اور گیت لکھ کر اس کی تضحیک کی ۔ غرض ہر ممکن طریقہ سے مسمر اور اس کے طریق علاج کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کئے گئے ۔ مخالفت کا طوفان برپا کرنے میں مقتدر جماعت اور شاہی مجلس طبیہ (رائل سوسائٹی آف میڈیسن) پیش پیش تھے ۔ مجلس نے ڈاکٹروں کو متنبہ کیا ۔ کہ وہ اس نئے طریقہ علاج سے کوئی تعلق نہ رکھیں ۔ جب ان ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پیرس کے تیس ڈاکٹروں نے حیوانی مقناطیسیت سے علاج شروع کر دیا ۔ تو مجلس نے یہ احکام صادر کئے ۔ "کہ کوئی ڈاکٹر اس امر کا مجاز نہیں ہے ۔ کہ وہ حیوانی مقناطیسیت سے علاج کرے ۔ یا اس کی حمایت میں کچھ تحریر کرے ۔ جو ڈاکٹر ان احکام کی تعمیل نہ کرے گا ۔ اس سے پیشے کے تمام حقوق چھین لئے جائیں گے"۔ شاہی مجلس طبیہ کا ایک ممبر ڈاکٹر ڈیسلن روشن دماغ اور آزاد خیال شخص تھا ۔ اس نے انجمن کے اس طرز عمل کی مذمت کی اور مسمر کے طریق علاج کو سراہا ۔ لیکن یہ حمایت بہت مہنگی پڑی ۔ ڈیسلن کے ہم پیشہ ڈاکٹر اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ۔ اور اس کی عزت و شہرت کچھ کام نہ آئی ۔ تاہم اس کی کوششوں سے اتنا ہوا کہ مجلس کے صدر نے مسمر کو تحریر کیا ۔ کہ "ہم چند مریض منتخب کرتے ہیں ۔ آپ ان کا علاج کریں ۔ تاکہ پتہ چل جائے کہ یہ طریق علاج کس حد تک مفید ہے"۔ مسمر اس تجویز سے متفق نہ ہو سکا ۔ اور اس نے جواب دیا "میرا گذشتہ تجربہ شاہد ہے کہ یہ طریقہ مفید ہے"۔ اس نے یہ متبادل تجویز پیش کی کہ "جو مریض خود بخود میرے پاس آئیں ۔ آپ ان کا معائنہ کریں ۔ اور علاج کے بعد دوبارہ ان کا امتحان کیا جائے"۔ اس درخواست کو مجلس نے منظور کرنے سے انکار کر دیا ۔ اس پر مسمر نے پھر اندھے، بہرے اور اعصاب زدگی کے مریض منتخب کئے اور مجلس کو لکھا کہ ان کا اپنی طرح طبی امتحان کرایا جائے ۔ لیکن اس کا جواب تک نہ دیا گیا ۔ ڈیسلن کی کوشش سے صرف تین ڈاکٹروں نے ذاتی حیثیت میں آ کر مریضوں کا طبی امتحان کیا ۔ علاج کے بعد جب مریضوں کو آرام آ گیا ۔ تو پھر انہوں نے مریضوں کا معائنہ کیا ۔ جو فائدہ مسمر کے علاج سے ان مریضوں کو پہنچا تھا ۔ وہ اس سے بھی انکار نہ کر سکے ۔ لیکن جب انہیں کہا گیا ۔ کہ وہ اپنے مشاہدہ کو من و عن تحریر کر دیں تو انہوں نے انکار کر دیا ۔ اور یہ عذر پیش کیا کہ ممکن ہے مریضوں کو اتفاقاً فائدہ ہو گیا ہو ۔ اس پر مسمر نے تجویز کی کہ جو مریض موجود ہیں ۔ ان میں سے جن کو وہ ذاتی طور پر ایسے مریض سمجھتے ہوں ۔ کہ انہیں بغیر علاج کے آرام نہیں آ سکتا ۔ انہیں چن لیں ۔ لیکن وہ اس پر بھی راضی نہ ہوئے ۔ اور عذر پیش کیا ۔ کہ ان کے پاس اتنا وقت نہیں کہ اس کے علاج کے دوران تمام عرصہ زیر نگرانی رکھ سکیں ۔ کہ وہ مریضوں کو بلا ناغہ دیکھ سکیں ۔

مسمر کے ستائیس اصول ۔ اندرونی تنظیم کی سعی پیہم میں مسمر کو ہر جانب ناکامی سے دوچار ہونا پڑا ۔ اس نے ایک آخری کوشش اور کی ۔ اس اثنا میں ڈاکٹر ڈیسلن نے مجلس کو مسمریزم کے بنیادی اصول پر غور و خوض کے لئے آمادہ کر لیا ۔ متواتر انکار کے بعد وہ بمشکل اس کو تسلیم کر سکا ۔ اس پر مسمر نے ۲۷ اصول تحریر کر کے شاہی مجلس طبیہ کو بھیجے جن کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) اجرام فلکی، زمین اور جاندار اجسام کا باہمی اثر ہوتا ہے ۔ (۲) یہ اثر ہر چیز میں موجود ہے ۔ یہ تمام اشیا میں اس طرح مسلسل بہتا ہے کہ کہیں بھی خلا باقی نہیں رہتا ۔ اس کی تیزی کا مقابلہ کسی چیز سے نہیں ہو سکتا ۔ (۳) یہ باہمی فعل میکانکی (Mechanical) اصول کے ماتحت ہے ۔ جو ابھی تک نامعلوم ہے ۔ (۴) اس فعل سے دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں جنہیں مد و جزر کی مانند سمجھا جا سکتا ہے (۵) اس مد و جزر کے کم و بیش یا عام و خاص ہونے کا انحصار ان امور پر ہے جن سے یہ فیصلہ کیا جائے (۶) اس عمل کے ذریعے جو بہت عام ہے ۔ اور جسے قدرت نے ہمیں بخشا ہے یہ رشتہ اجرام فلکی، کرہ زمین اور اس کے حصص میں قائم ہے (۷) مادہ اور جاندار اجسام کی خاصیتوں کا انحصار اس عمل پر ہے (۸) حیوانی جسم اس کی قوت عاملہ (Agent) کے متضاد اثرات کو محسوس کرتا ہے ۔ یہ عامل اثر انسان کے اعصاب میں مسلسل لیکن آہستہ آہستہ داخل ہو کر پیدا کرتا ہے ۔ (۹) انسانی جسم میں مقناطیس کی خصوصیات پائی جاتی ہیں ۔ مختلف اور متضاد قطبے شناخت کئے جا سکتے ہیں ۔ یہ قابل انتقال ہیں ۔ ان سے طاقت پیدا کی جا سکتی ہے ۔ یہ تبدیل ہو سکتی ہے ۔ حتیٰ کہ اس سے کھینچنے اور رد کرنے کا عمل بھی بخوبی سرانجام پا سکتا ہے (۱۰) حیوانی جسم کی یہ خاصیت جو اجرام فلکی سے متاثر کرتی ہے اور ان کے باہمی عمل سے حاصل ہوتے ہیں ۔ مزید برآں اس کی مقناطیسی یکسانیت نے مجھے اس امر پر مجبور کیا ہے کہ میں اسے حیوانی مقناطیسیت سے موسوم کروں (۱۱) حیوانی مقناطیسیت کا اثر اور جس کا ذکر ہو چکا ہے ۔ دوسرے اجسام پر ڈالا جا سکتا ہے ۔ جو جاندار ہوں یا بے جان (۱۲) [illegible] یہ فاصلہ سے پیدا کی جا سکتی ہے اور منتقل ہو سکتی ہے (۱۳) اس مادہ کا بہاؤ جو اپنی لطافت کے باعث تمام اجسام [illegible] (۱۴) اس کا اثر بغیر کسی وساطت

(میڈیم Medium) کے ذریعہ دور دراز مقام تک ہوتا ہے (۱۵) یہ روشنی کی طرح بڑھایا اور منتقل ہو سکتا ہے (۱۶) یہ آواز کے ذریعہ پہنچایا، پھیلایا اور بڑھایا جا سکتا ہے (۱۷) یہ مقناطیسی قوت ایک جا مجتمع ہو سکتی ہے۔ مرکوز بڑھائی جا سکتی ہے مانند منتقل کی جا سکتی ہے (۱۸) سب جاندار یکساں ذکی الحس نہیں ہوتے۔ شاذونادر ایسے اجسام ہیں جن کی خاصیتیں بالکل متضاد ہوتی ہیں۔ ان کا یہ جذبہ مقناطیسی اثر دوسرے اجسام سے زائل کر دیتا ہے (۱۹) یہ دوسرے اجسام سے گزرتی ہے۔ مجتمع اور منتقل ہو سکتی ہے۔ آئینہ میں سے گزر سکتا ہے آواز سے پھیلائی جا سکتی ہے۔ یہ صرف نقصان ہی نہیں بلکہ مفید بھی ہے (۲۰) یہ مقناطیس قدرتی ہو یا مصنوعی بہر صورت دوسرے اجسام کی طرح حیوانی مقناطیسیت کے زیر اثر ہے۔ یہ بغیر لوہے دوستی پر عمل کے تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حیوانی مقناطیسیت کا اصول کانی مقناطیسیت کے بالکل برعکس ہے (۲۱) یہ طریقہ آگ اور روشنی کے متعلق نئے خیالات کا باعث بنے گا نیز کشش، مدوجزر، مقناطیس اور بجلی کی وضاحت کرے گا (۲۲) اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ مقناطیس اور مصنوعی بجلی امراض پر ایسے اثرات رکھیں گی جیسے دوسری قدرتی اشیاء اگر کوئی فائدہ ان کے استعمال سے ہوگا تو محض حیوانی مقناطیسیت کے باعث (۲۳) اس اصول سے تمام اعصابی اور بیرونی امراض جلد دور ہو جایا کریں گے (۲۴) اس کی مدد سے اطباء کو معلوم ہو جائے گا کہ دوا کیسے استعمال کی جائے اور اس کا براہ راست اثر زیادہ سے زیادہ کیسے ہو سکتا ہے (۲۵) یہ طریقہ بتاتے ہوئے میں امراض کے نئے نظریات اس اصول کا عام نفاذ ظاہر کرنے لگا (۲۶) اس کا علم ہونے پر اطباء امراض کو چاہے کتنے پیچیدہ ہوں بخوبی جانچ سکیں گے وہ ان کی ترقی روک سکیں گے اور صحت بحال کر سکیں گے۔ حاملہ عورتیں بھی اس سے بہرہ یاب ہو سکتی ہیں (۲۷) اس اصول پر عمل پیرا ہو کر طبیب مریضوں کو امراض و آلام سے نجات دلا سکیں گے اور اس سے بیمار پوری طرح کامیابی حاصل کریں گے۔

مسمر پر مجلس طبیہ کا عتاب۔ شاہی مجلس طبیہ نے ان اصولوں پر غور و فکر کی زحمت نہ کی۔ گویا ابھی انہیں کی انگریز علم تو مقناطیسیت کے قابلیت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لیے مسمر کی طبی سند جو اس نے میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد امتحان پاس کر کے لی تھی منسوخ قرار دی اور اس کا نام ڈاکٹروں کی فہرست سے خارج کر کے اسے پیشہ کے حقوق و مراعات سے محروم کر دیا۔ ۱۷۸۱ء میں مسمر پیرس سے اسپا میں منتقل ہو گیا۔ یہاں بھی اس کے خلاف سلسلہ حسب سابق برقرار رہا۔ ۱۷۸۴ء میں مختلف تحقیقاتی مجالس علمیہ نے حیوانی مقناطیسیت کے بارے میں یہ فیصلہ صادر کیا کہ ہمارے تجربات میں کہیں حیوانی مقناطیسیت کا وجود نہیں ملتا۔ لیکن اس کے اثرات سے وہ انکار نہ کر سکے۔

مارکوئس ڈی پوسیگر۔ ۱۷۸۴ء میں مارکوئیس ڈی پوسیگر (Marquis De Puysegur) نے جو مسمر کا پیرو اور ایک شریف اور نیک طبیعت شخص تھا۔ علاج کا ذریعہ تشنج کی بجائے مقناطیسی نیند کو قرار دیا۔ اس کی بنیاد اس نے دماغی کیفیت کے ایک انکشاف پر استوار کی جسے مصنوعی سکتہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ مارکوئیس کا طریق علاج زیادہ صحیح اور باقاعدہ تھا۔ اس کے پاس علاج کے لئے دور دراز سے مریض آتے تھے جنہیں وہ ایک مقناطیسی درخت کے گرد بٹھا کر خواب گوں نیند میں ڈال دیتا تھا۔ ان میں سے کثیر تعداد شفایاب ہو کر گھروں کو لوٹتی تھی۔

حیوانی مقناطیسیت جرمنی میں۔ اب تک حیوانی مقناطیسیت کا مرکز فرانس تھا اور دوسرے ممالک میں اس کا اثر برائے نام تھا۔ اس زمانہ میں انقلاب فرانس کی وجہ سے مسمر کے پیروؤں کو بحالت مجبوری ترک وطن کر کے دوسرے ممالک میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ خود مسمر نے بھی فرانس چھوڑا اور بعض یورپی ممالک کی سیر و سیاحت کے بعد اپنے وطن میں قیام پذیر ہو گیا۔ اس سے فرانس میں حیوانی مقناطیسیت عارضی طور پر مردہ ہو گئی لیکن مسمر کے پیرو جہاں گئے ان کے ہمراہ لازماً ان کے عقائد بھی ان ممالک میں پہنچے۔ جرمنی بالخصوص اس کے احاطہ اثر میں آیا۔ ۱۷۸۷ء میں [illegible] نے برمین کے اطباء کے سامنے مقناطیسیت کے اعمال کا مظاہرہ کیا۔ مشہور طبیب ڈین بالٹ اس سے خصوصاً متاثر ہوا۔ مؤلفین حامیین مقناطیسیت کی بہت سی مخالفتوں کے باوجود جس سے یہ بدنام بھی ہو گئی۔ اسے جرمنی میں کافی عمل دخل حاصل ہو گیا۔ اس کے متعلق بہت سی کتابیں تحریر کی گئیں۔ ان میں بالعموم علمی نقطہ نظر سے بحث کی گئی۔ ۱۷۸۹ء میں ڈاکٹر [illegible] نے اپنے جو تجربات برلن سے شائع کئے۔ ان میں سحر اور غیب دانی وغیرہ کو دخل تصور نہ کیا۔ ۱۸۱۲ء میں حکومت جرمنی نے [illegible] کو مسمر کے پاس مقناطیسیت کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ برلن واپس آ کر اس نے مقناطیسی علاج شروع کر دیا۔ بعد ازاں اسے برلن یونیورسٹی کا پروفیسر بنا دیا گیا۔ ۵ مارچ ۱۸۱۵ء کو مسمر [illegible] کی مختصر علالت کے بعد جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ اسے میرسبرگ میں دفن کیا گیا۔ اس کے مدفن پر برلن کے ماہرین طب کی جانب سے یادگار کے طور پر ایک کتبہ نصب کیا گیا۔ جرمنی میں مقناطیسیت کے [illegible] حکومت نے کچھ کاروائیاں ضرور کیں۔ لیکن

اس نے کوئی سخت قدم نہ اٹھایا۔ اس لئے اس نے خوب ترقی کی۔ بہت سے ماہرین نے پوری سنجیدگی سے اس کی تحقیق کی۔ یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم دی جانے لگی۔ ۱۸۱۲ء میں پرشیا میں بھی شاہی فرمان کے ذریعے اس پر عائد شدہ پابندیوں کو دور کر دیا گیا۔ اس زمانہ میں یورپ کے دوسرے اکثر ممالک کی حکومتیں اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ اس سے سرد مہری روا رکھنے کے علاوہ وہ بعض اوقات پابندیاں عائد کر دیتی تھیں۔ ۱۸۱۵ء میں آسٹریا میں مقناطیسیت سے علاج قانوناً ممنوع تھا۔ ڈنمارک اور روس میں اس کے معالجوں پر یہ پابندی لگی کہ وہ مریضوں کے متعلق اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کیا کریں۔

فرانس میں احیاء۔ انیسویں صدی کے اوائل میں فرانس میں مقناطیسیت کا احیاء ہوا۔ بے جا نہ ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا سہرا فاریا کے سر ہے۔ اگرچہ اس سے قبل مقناطیسیت کا چرچا شروع ہو چکا تھا۔ فاریا پرتگیزی تھا۔ تنویم کی تاریخ میں اس کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ہندوستان سے پیرس وارد ہونے کے کچھ عرصہ بعد ۱۸۱۳ء میں اس نے تجربات سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچایا۔ کہ مقناطیسی نیند کسی نامعلوم قوت کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کا سبب معمول ہی میں ہوتا ہے۔ فی الحقیقت یہی خیال تنویم اور تاثیر کی سنگ اساس ہے۔ فاریا واحد شخص تھا۔ جو اس عہد میں تنویم کے متعلق صحیح خیالات رکھتا تھا۔ اس کی کوششوں سے ایک حد تک لوگوں کے شکوک اس کے متعلق زائل ہوگئے۔ اس زمانہ کا مشہور جنرل نوئزٹ اس سے خاص طور پر متاثر ہوا۔ فاریا نے اس پر بھی عمل کیا۔ اور اگرچہ جنرل پر گہری نیند یعنی موجودہ اصطلاح کے مطابق ہپناٹائز کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جنرل نوئزٹ نے اعتراف کیا کہ وہ فاریا کی اجازت کے بغیر آنکھیں نہ کھول سکا۔ فاریا اپنی تمام تر ہوشمندی کے باوجود حماقت کر بیٹھا۔ جس سے اس کی بنی بنائی عزت خاک میں مل گئی۔ اور اسے دھوکہ باز اور فریبی سمجھا جانے لگا۔ بات یہ ہوئی۔ کہ اس نے اپنی کامیابی کی نمائش کیلئے ایک ایکٹر کو ساتھ ملا لیا۔ کہ وہ عمل کے اثر کے بغیر لوگوں کو متاثر کرنے کیلئے اپنے آپ کو حالت تنویم میں ظاہر کرے۔ اس ایکٹر نے سازش کا بھانڈا چوراہے پر پھوڑ دیا۔ فاریا خود تو بدنام ہوا۔ اس کے ساتھ مخالفوں کو بھی باتیں بنانے کا موقعہ مل گیا۔ انہوں نے جی بھر کر اس واقعہ کو ہوا دی۔ اور لوگوں کے اعتقادات بھی اسی وجہ سے متزلزل ہوگئے۔ تاہم اس کے بعد بھی فاریا کے خیالات کی تقلید میں جنرل نوئزٹ اور ماہر برٹرینڈ نے کام کیا۔ ۱۸۲۰ء میں پیرس کے شفاخانوں میں مختلف ماہرین نے تجربات کئے۔ ۱۸۲۶ء میں پیرس کی مجلس اعلیٰ طبیہ کی طرف سے اس کی تحقیق و تفتیش کیلئے ایک تحقیقاتی مجلس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس نے طویل طویل مدت تک تحقیق کے بعد ۱۸۳۱ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ چونکہ مجلس کا تمام تر زور تحقیق اس مسئلہ کے سحر والے پہلو پر تھا۔ اس لئے مجلس اعلیٰ طبیہ کیلئے یہ کام طمانیت بخش ثابت نہ ہو سکا۔ اور ۱۸۴۰ء میں مجلس اعلیٰ طبیہ کی طرف سے دوبارہ تحقیقاتی مجلس کا قیام عمل میں آیا۔ اس اثنا میں فرانس میں مقناطیسیت کے متعلق بہت سی عمدہ کتابیں شائع ہوئیں۔

نظریہ اوڈ۔ جرمنی میں مقناطیسیت دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتی گئی۔ ۱۸۵۶ء میں ماہر وقدم نے اس کے متعلق ایک ضخیم کتاب تحریر کی۔ لیپزگ کے ماہر کیمیا و طبعیات کارل فریڈرش باخ نے نظریہ اوڈ پیش کیا۔ جو فی الحقیقت مقناطیسیت کیلئے راہ ہموار کرنے کا باعث ہوا۔ اس نظریہ کا لب لباب یہ ہے۔ کہ "اوڈ ایسی غیر مادی قوت ہے۔ جو مقناطیسیت سے مشابہ ہوتے ہوئے بھی اس کے عجیب و غریب مظاہر اور مخصوص قوانین سے بے تعلق ہے۔"

حیوانی مقناطیسیت انگلستان میں۔ انگلستان میں مختلف ماہرین کی کوششوں کے باوجود حیوانی مقناطیسیت کا زیادہ چرچا نہ ہو سکا۔ علمی حلقوں نے بالخصوص اسے دور از عقل افسانہ سمجھا۔ غیر فنی لوگوں نے اس سے زیادہ دلچسپی لی۔ یہ دونوں طبقے ایسے طریقوں پر ابتدائی کام کر رہے تھے۔ جن پر فرانسیسیوں نے شروع کیا تھا۔ انہیں بھی ویسی ہی مشکلات اور مخالفتیں درپیش آئیں۔ انگلستان میں سب سے پہلے مسمرزم سے نمایاں دلچسپی جان ایلیٹسن ([illegible]) نے لی۔ جسے اس کا شوق ایک فرانسیسی امیر کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ اس امیر کے مکان پر مختلف اخیار مقناطیسیت کے تجربات دیکھنے کیلئے جمع ہوتے تھے۔ ایلیٹسن اس زمانہ میں لندن کا سرکردہ طبیب اور شاہی طبی اور جراحی مجالس کا صدر تھا۔ یونیورسٹی کالج کے ہسپتال میں اسے جو تجربہ ہوا تھا۔ اس سے متاثر ہو کر اس نے مختلف امراض کے مریضوں کے علاج میں حیوانی مقناطیسیت کو برتنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اسے عصبی امراض اور اختناق الرحم کے علاج میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس کے ہم پیشہ اطباء نے اس کی سخت مخالفت شروع کر دی۔ اور صورت حالات اس قدر ناسازگار ہوگئی کہ ارباب اختیار یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ آئندہ وہ مسمرزم سے کام نہ لے۔ ایلیٹسن اس حکم کی تعمیل پر راضی نہ ہوا۔ جس پر اسے ہاسپٹل فزیشن کے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے بعد اس نے اپنے آپ کو بالکل مقناطیسیت کیلئے وقف کر دیا۔ اور وہ اسی طریقہ علاج کے مطابق مطب کرتا رہا۔ اس نے ایک سہ ماہی رسالہ زائیسٹ (ZOIST) [illegible] سال تک جاری رہا۔

ایسڈیل کے تجربات ۔ ۱۸۴۵ء میں ڈاکٹر جیمز ایسڈیل (Dr. James Esdaile) کو جو کلکتہ کے ایک سرکاری ہسپتال کا انچارج ہو کر انگلستان سے آیا تھا، ڈولیت کے مطالعہ سے مقناطیسیت سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ اس وقت ہگلی کے ہسپتال کا انچارج تھا۔ چونکہ ابھی کلوروفارم رائج نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس نے عمل جراحی میں مقناطیسی نیند سے کام لینا شروع کیا۔ اس تجربہ میں اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد اس نے میڈیکل بورڈ کو تحریر کیا۔ کہ وہ اس طریقہ پر عملیہ کر چکا ہے۔ جن میں مریضوں کو قطعی تکلیف نہیں ہوئی۔ گو میڈیکل بورڈ نے تو اس کی درخواست پر توجہ نہ کی۔ لیکن حکومت نے کچھ عرصہ بعد خاص تحقیقاتی مجلس کی رپورٹ پر اسے ایک بڑے ہسپتال کا انچارج مقرر کر دیا۔ جہاں اسے شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ ایک سال بعد حکومت نے اس سلسلہ کو ختم کر دیا۔ قبل ازیں ایسڈیل کے لاتعداد مداحوں نے حکومت کو درخواست بھیجی کہ اسے جاری رکھا جائے۔ جب حکومت نے اسے منظور نہ کیا۔ تو انہوں نے اس کے لئے ایک خاص ہسپتال قائم کر دیا۔ جہاں اس نے اپنا کام جاری رکھا۔ اس کی شاندار کامیابی سے دوبارہ حکومت کی توجہ مبذول ہو گئی۔ اور اسے سرکاری ہسپتال میں تعینات کر دیا گیا۔ یہاں ۱۸۵۱ء تک جب سے وہ ہندوستان سے رخصت ہوا۔ اس نے ہزاروں مریضوں پر مقناطیسی نیند کے دوران میں بلا تکلیف عمل جراحی کیا۔ کلکتہ میں ڈاکٹر ایسڈیل کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ لوگ اسے "جادو والا صاحب" کہتے تھے۔ سکاٹ لینڈ واپس جانے کے بعد بھی وہ اس طریقہ سے عمل جراحی میں کام لیتا رہا۔ لیکن اس کے ہم پیشہ ڈاکٹروں نے اس کی سخت مخالفت کی اور طبی رسائل نے جراحت کے ان اعمال کے نتائج شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ جو وہ مقناطیسی نیند کے دوران میں کیا کرتا تھا۔

حیوانی مقناطیسیت کا تنویم سے تعلق ۔ جیمز بریڈ مانچسٹر کا ایک سرجن تھا۔ ۱۸۴۱ء میں ایک عامل مقناطیسیت لافونٹینی نے اپنے فن کا مظاہرہ مانچسٹر میں کیا۔ جس سے ماہر بریڈ کی دلچسپی کا آغاز ہوا۔ حتیٰ کہ اس نے مقناطیسیت سے ہٹ کر ایک نئی شاہراہ تلاش کی۔ فی الحقیقت تنویم کی تاریخ جدید اسی سے شروع ہوتی ہے۔ تنویم کے پیشرو نے اپنے جانشین کیلئے جگہ خالی کرنی شروع کی یہاں تک کہ مسمرزم اور حیوانی مقناطیسیت کی اصطلاحیں قصہ پارینہ ہو کر رہ گئیں۔ یہ سب کچھ بہت آہستہ آہستہ ہوا۔ مقناطیسیت کا اثر انیسویں صدی کے اواخر تک رہا۔ آج بھی بعض جگہ اس کے نشان نظر آ جاتے ہیں۔ تنویم کی تاریخ علمی نقطہ نظر سے بیان کرنے سے قبل اس کا مقناطیسیت سے رشتہ اور اس کی ناکامی پر ایک نظر ڈال لینی چاہیئے۔

لائیڈ ٹکی کی رائے ۔ مسمرزم اور مقناطیسیت کو آج کل بالعموم سراہا نہیں جاتا۔ اور ماہرین تنویم تو بالخصوص اس سے اپنا تعلق گوارا نہیں کرتے۔ ماہر سی لائیڈ ٹکی نے (C. LLOYD TUCKY) اپنی کتاب Treatment by Hypnotism Suggestion ٹریٹمنٹ بائی ہپنوٹزم اینڈ سجیشن میں تحریر کیا ہے۔ "شاید عاملین مقناطیسیت کا سب سے بے بنیاد دعویٰ یہ ہے۔ کہ انہوں نے اس موضوع کو تجربات و اعمال سے عوام کے سامنے رکھا۔ اس کا جواب بآسانی دیا جا سکتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے۔ کہ تنویم کا نظریہ اور طریقہ جسے آج برتا جاتا ہے۔ ہر اعتبار سے ان کے اعمال سے جداگانہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے مظاہروں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا۔ کہ اس شعبہ یا طبی سائنس کو حقیر اور ارباب طب کو اس کے خلاف کر دیا۔ اٹھارویں صدی کی ابتداء سے آج تک ان کے طریق کار میں مشکل ہی کوئی تبدیلی یا ترقی ہوئی ہو گی۔"

نقد و نظر ۔ مسمرزم و مقناطیسیت کو مشکوک کرنے کے باوجود کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ مریض اس سے متواتر شفایاب ہوتے رہے۔ جس کے نتیجہ میں انیسویں صدی میں اسے قبول عام کا شرف حاصل ہوا۔ اور اس کا احاطہ اثر یورپ کے اکثر حصوں تک وسیع ہو گیا۔ جا بجا شہروں میں اس کی حمایت کیلئے مجالس قائم ہوئیں۔ بڑی کثرت سے کتابیں اور رسالے شائع ہوئے۔ اور آخر میں سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے اکثر قائلین اور معتقدین مسلم قابلیت، شہرت اور علمیت کے مالک تھے۔ امر واقعی یہ ہے۔ کہ ماہرین مقناطیسیت نے اپنے نظریوں کی بنا حقیقی مشاہدات پر نہیں رکھی کہ انہیں تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا۔ ایسے نہ ہونے کے باوجود جو جامہ انہیں پہنایا گیا وہ نیا تھا۔ موجودہ ماہرین کے نزدیک یہ تمام نظریے سراسر خیالی ہیں۔ البتہ جن واقعات پر ان نظریوں کی بنا رکھی گئی۔ وہ اس قدر مصدقہ ہیں کہ بالآخر ان پر تنویم اور نفسی مرضیات کی اساس رکھی گئی۔ عاملین مقناطیسیت نے قریباً ان تمام واقعات کا مشاہدہ کیا۔ جنہیں بعد میں ماہرین تنویم نے اپنایا۔ اس ضمن میں عامل کی مرضی سے بے حسی، تشنج، موہوم خیالات پیدا کرنا شامل ہے اور وہ سب کچھ جسے آج کل مابعد تنویمی تلقین (Post Hypnotic Suggestions) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عاملین مقناطیسیت کے مشاہدات صحیح اور درست تھے۔ لیکن ان مشاہدات کی توجیہ جو مقناطیسی سیال کے ذریعہ کی ۔ وہ فرسودہ اور سراسر غلط تھا۔ تاہم

ان کی تالیفات میں نفسیاتی تحقیق کی ابتدا ظاہر ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اور وہ نسبتاً زیادہ سائنٹیفک طریقہ پر اس کی توجیہہ کرنے لگے تھے۔

بریڈ کے تخیلات ۔ بریڈ نے تنویم کے سلسلہ میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ اس نے اس سے عملی طور پر کام لینے کے علاوہ اس کے مظاہر کو سمجھنے اور اس کا مطالعہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس نے بہت سے نظریات پیش کئے۔ بالآخر [illegible] کی طرح اس نے بھی یہ رائے ظاہر کی۔ کہ حیوانی مقناطیسیت کے مظاہر کو مقناطیسی سیال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس نے ثابت کیا۔ کہ تشنج، بے حسی اور دوسرے مظاہر مقناطیسیوں اور مخصوص طریقوں کے ذریعے ([illegible]) سے پیدا نہیں ہوتے۔ بلکہ عامل کے احکام و اشاروں سے معمول کے ذہن میں جو توجہ اثر پیدا ہوتا ہے اس کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس نے خیال پیش کیا کہ تنویم اور مظاہر تنویم توجیہ (Suggestion) سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کی توجیہہ نفسیاتی اصولوں سے کرنی چاہیئے۔ ۱۸۴۳ء میں اس موضوع کے متعلق اس کی کتاب نیوریپنالوجی (Neurypnology) شائع ہوئی ہے۔

اس سلسلے میں بریڈ کے ساتھ فرانس کے ماہر برٹرانڈ (Bertrand) کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان دونوں کی تالیفات توجیہ کے نظریہ کی وضاحت کا اولین ذریعہ ثابت ہوئیں۔ ان سے قبل بعض فرانسیسی ماہرین نے بھی اس پر روشنی ڈالی تھی۔ اسلئے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس تحقیق کو سب سے پہلے کس محقق نے روشناس کرایا۔ اس سے بریڈ کے کام کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ بریڈ نے مسمرازم کے لفظ کو ترک کر دیا۔ اور اس کی بجائے ہپناٹزم (تنویم) کو مروج کیا جو ہپناسس (Hypnosis) یعنی نیند سے مشتق ہے۔ اس سے قبل ایک فرانسیسی [illegible] ڈی کویلر نے انہی واقعات کیلئے ہپنوسکوپ اور ہپنوجینک وغیرہ الفاظ استعمال کئے تھے۔ بریڈ کے نئے نظریے کی بنا پر اس کے ہمعصر بالخصوص ایلیٹ سن اور سنڈیل وے اپنا مخالف بھی سمجھتے رہے۔ بریڈ نے یہ امر بھی دریافت کیا کہ اگر کسی شخص کی آنکھیں اس کے سر کے اوپر کسی چمکدار چیز پر مرکوز کر دی جائیں اور اس کے ساتھ ہی اس کا ذہن بھی اس طرف متوجہ کر دیا جائے تو اس میں حالت تنویم پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نے تحقیق کیا کہ مختلف لوگوں میں تنویمی نیند کی میعاد مختلف ہوتی ہے۔ بعض اونگھنے لگتے ہیں اور بعض بے خبر ہو جاتے ہیں۔ اس نے رائے دی۔ کہ معالج تنویم کے الفاظ صرف ان حالتوں میں استعمال کرنے چاہئیں۔ جب معمول تسلیم کرے کہ اثنائے خواب میں جو کچھ ہوا اسے اس کا علم نہیں [illegible] تنویم کو معالجات کے علاوہ اعمال جراحی میں بھی برتا۔ پہلی کتاب کے چند سال بعد اس نے دوسری کتاب شائع کی۔ تاہم تنویم کو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی [illegible] برطانیہ میں اس کام سے دلچسپی لینے والے اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس کے بعد مختلف ماہرین نے تنویم سے دلچسپی لی۔ لیکن اصل میدان لیبالٹ ([illegible]) کے ہاتھ رہا۔

نانسی کا مکتب ۔ لیبالٹ ۱۸ ستمبر ۱۸۲۳ء کو فیئر پرس ([illegible]) فرانس میں پیدا ہوا۔ اس نے ایم ڈی کی ڈگری سٹراسبرگ یونیورسٹی سے لی۔ چند سال دیگر قصبوں میں مطب کرنے کے بعد وہ نانسی (Nancy) میں قیام پذیر ہو گیا۔ یہیں اس کی تنویم اور مقناطیسیت سے دلچسپی کا آغاز ہوا۔ مقناطیسیت کا وہ قائل نہ ہو سکا۔ اور اس نے اسے جلد ہی رد کر دیا۔ اس کے برعکس تنویم نے اس کی تشفی کر دی۔ تحقیقات سے وہ جن نتائج پر پہنچا وہ ہر چند ان سے مختلف نہ تھے جو بریڈ نے حاصل کئے تھے۔ لیکن اس نے ان نتائج کو وسعت بخشی اور توجیہ کی کارفرمائی کی وضاحت کی۔ اس نے ۱۸۶۶ء میں نانسی میں ایک پمفلٹ لکھا جسے وہ علاج بالتوجیہ (Treatment by Suggestion) سے موسوم کرتا تھا۔ عام طور پر وہ برتنا شروع کر دیا۔ وہ مریضوں سے فیس نہیں لیتا تھا۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ حصول زر کیلئے تنویم کرتا ہے۔ لیبالٹ مریضوں سے کہا کرتا تھا۔ "اگر تم علاج چاہتے ہو تو میں کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کیلئے تمہیں قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اگر تم مجھے تنویم برتنے دو گے۔ تو میں کوئی فیس نہیں لونگا۔" تنویم پیدا کرنے کیلئے مقناطیسی سیال، روشن چیز پر نظر جمانے یا مجالوں کی ضرورت نہ سمجھتا تھا۔ وہ مریض سے کہتا "ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھتے جاؤ" اور تھوڑی دیر بعد کہتا۔ "تمہارے پپوٹے بھاری ہو رہے ہیں۔ اب تم اپنی آنکھیں نہیں کھول سکتے۔" مریض کو اس طرح سلانے کے بعد وہ معالجانہ توجیہ دیتا۔ جو ذہنی یا جسمانی مرض کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوتی تھی۔ لیبالٹ کو اگر ذہنی علاج کا بانی کہا جائے تو بےجا نہ ہوگا۔ مسمرازم کے حامیوں کی حرکتوں سے اس طریق علاج کی جو بدنامی ہوئی اسے دور کرنے کا سہرا اسی کے سر ہے۔ ۱۸۶۶ء میں اس کی تصنیف شائع ہوئی۔ جس میں اس نے اپنے نظریات اور طریقہ کار وضاحت سے بیان کیا۔ لیکن اس وقت اس کی طرف توجہ نہ کی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸۸۲ء میں نانسی کے پروفیسر برنہیم (Bernheim) نے ڈاکٹر ڈوموں کے زیر اثر اس کی تحقیق شروع کی۔ نانسی میں خاموشی سے جو کام کیا جا رہا تھا اس نے جلد ہی اس کی اہمیت کو محسوس کر لیا۔ اور [illegible] کا رفیق کار بن گیا۔ ۱۸۸۶ء میں اس کی معیاری کتاب سجیسٹو تھراپیوٹکس (Suggestive Therapeutics) شائع ہوئی۔

سال پیتریئر کا مکتب ۔ [illegible] (Salpetriere) ہسپتال پیرس کے چارکوٹ نے

جو اعصاب اور سائنس کا ماہر تھا۔ لیبالٹ سے آزادانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس نے مقناطیسیت کے قائلین کے بیان کردہ مظاہر کی اپنے شاگردوں کی امداد سے جانچ کی۔ پال رچر (Paul Richer) کا نام نمایاں ہے۔ سالپیٹریر میں تحقیقات کی۔ اس کے شاگردوں میں فیرے، بینیٹ، بابنسکی اور جینارڈ وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ۱۸۷۸ء میں شارکٹ نے حالتِ تنویم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ۱۸۷۹ء میں اس نے اپنے تنویمی تجربات کا مظاہرہ کیا۔ ۱۸۸۱ء میں رچر کی تصنیف شائع ہوئی۔ جس میں اس نے اپنے استاد کے بہت سے تجربات بیان کئے ہیں۔ شارکٹ نے خیال ظاہر کیا کہ حالتِ تنویم ایسی حالت ہے۔ جو خالص جسمانی اور طبعی ذرائع سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کے تین درجے ہیں۔ جمود، خواب غفلت اور سومنا بولزم (خواب خرامی) گویا یہ ایک فعلیاتی قانون کا لابدی ارتقاء ہے۔ ہر درجہ مخصوص اعمال سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً آخری درجہ سر کو سہلانے سے۔ مقناطیس اور دھاتیں بھی اور دوسرے مظاہر کو پیدا اور رفع کرنے کے لیے خصوصیت سے کارگر ہوتی ہیں۔ "کچھ مریضوں کے مشاہدے سے جو سب اختناق الرحم کے مریض تھے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ حالتِ تنویم ہمیشہ اختناق الرحم کا لازمہ بلکہ عملی طور سے اس کے ہم معنی ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تنویمی حالت محض اختناق الرحم اور اس کے متعلقہ مظاہر یعنی حسی سکتہ اور پراگندہ خیالات کی سی ایک صورت ہے۔ اور اس قسم کی حالت صرف اختناق الرحم کے مریضوں میں پیدا کی جا سکتی ہے۔

سالپیٹریر سے مکتب کی ناکامی کے اسباب۔ شارکٹ نے جو مریضوں کے صحیح معائنے اور خارجی واقعات کو کوئی اہمیت نہ دیا تھا۔ بظاہر یہ صحیح طریقوں اور امکانی احتیاط سے اس نظریہ پر پہنچا۔ جو مقناطیسیت کے نظریہ سے بھی زیادہ غلط تھا۔ اس خیال کی تردید لیبالٹ اور برنہیم کے علاوہ بعد کے سبھی محققین نے کی ہے۔ انہوں نے ثابت کیا۔ کہ امراض کو پیدا اور رفع کرنے میں مقناطیس یا جسمانی اعمال کا عامل دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ حالت عامل کے الفاظ اور معمول کی توقعات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور یہ مظاہر اوسط درجہ کی صحت والے شخص میں نہ صرف بحالتِ تنویم بلکہ بیداری کے عالم میں بھی پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ شارکٹ کے پیروؤں نے جنہیں سالپیٹریر سے مکتب یا پیرس مکتب سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تمام تر توجہ تنویم کی جسمیت پر صرف کر دیا۔ یہ درست ہے کہ شارکٹ توجہ کے تخیل سے ناواقف محض نہ تھا۔ لیکن اس نے تنویم میں اس کی وسعت، اہمیت اور استعمال کو کما حقہ سمجھا ہی نہ تھا۔ اس بنیادی غلطی سے اس کی تمام محنت اکارت ہو گئی۔ اس لئے سالپیٹریر سے کے مکتب فکر کی تحقیق نفسیات مرضیات میں کچھ زیادہ کام نہ آئی۔ البتہ شارکٹ کی اختناق الرحم کے متعلق تحقیقات ضرور قابلِ قدر ہے۔

موازنہ

یہاں تک نفسیات کی تاریخ کا ایک عمومی جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ سالپیٹریر سے مکتب کے مقابلہ میں نانسی کے مکتب نے جو کام کیا ہے جس کا تعلق براہ راست موجودہ تحقیقات سے ہے۔ برنہیم نے اپنے استاد کے عقائد میں ترمیم کی۔ لیبالٹ کا عقیدہ یہ تھا۔ کہ کسی شخص کو توجہ دینے کے لئے اس پر تنویمی حالت طاری کرنا ضروری ہے۔ لیکن برنہیم اس تخیل پر پہنچا۔ کہ ابتدائی حالت یا غنودگی کے وقت بھی توجہ عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ اور گہری نیند طاری کئے بغیر بھی توجہ سے علاج ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر ڈوبائے (Dr. Dubois) نے بعد میں برنہیم کے نظریہ میں مزید ترمیم کر کے یہ بتایا کہ عمل تنویم کے بغیر حالت بیداری میں بھی واضح اور اطمینان بخش دلائل سے یقین دلایا جا سکتا ہے۔

برنہیم کی تصنیف نے شارکٹ کے تخیل کو قریباً ختم کر دیا۔ نینسی مکتب کے متبعین نے یہ ثابت کیا۔ کہ تنویمی حالت پیدا کرنے میں زبانی طور پر توجہ دینے کو پورا پورا دخل ہے اور مقناطیسیت کے پیچھے تمام قائلین نے جن مظاہر کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ سب اسی توجہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے بتایا۔ کہ تنویمی حالت دراصل ایک نیند کی حالت ہے۔ جس میں توجہ کو قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ تنویمی حالت کسی خاص مرض کا مظہر نہیں ہے۔ جو صرف ہسٹیریا یا اسی قسم کے مریضوں پر طاری ہو سکے۔ بلکہ یہ ایک تندرست شخص میں پیدا کی جا سکتی ہے۔ نینسی مکتب نے اس طرح طب میں ایک اور باب کا اضافہ کیا۔ اور تسلیم کرایا کہ بعض ذہنی اور خالص ذہنی کیفیتیں بھی مرض کا باعث ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح ان کے عقائد سے یہ بھی ثابت ہوا کہ قدیم غیر متمدن قوموں میں علاج کے جو عجیب غریب طریقے رائج تھے۔ وہ اکثر توجیہی نوعیت کے ہوا کرتے تھے۔

برطانیہ میں بعد تنویم کی تاریخ میں بہت کم تبدیلیاں ہوئیں۔ انیسویں صدی کے بالکل آخیر میں یہ خیال عام طور پر پایا گیا۔ کہ تنویم اور توجہ کے مسائل پر بین الاقوامی طریقے سے غور و خوض کیا جائے۔ چنانچہ اگست ۱۸۸۹ء میں پیرس میں ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں تقریباً تمام

متعدد اقوام کے نمائندے شریک ہوئے۔ اور اس میں سب سے زیادہ کامیابی نینسی مکتب نے حاصل کی۔ اس کے بعد ایک اور کانفرنس سنہ ۱۹۰۰ء میں پیرس ہی میں منعقد ہوئی۔ اور اس کے بعد نفسیات کی کانفرنسیں بھی انعقاد پذیر ہوتی رہیں۔ جن میں تنویم وغیرہ کے مسائل زیر بحث آئے۔ سنہ ۱۹۱۳ء کی کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی۔ جس میں ماہرین نفسیات میں تنویم کے مسئلہ پر آپس میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

برنہیم کے بعد بروئر نے اول اول عصبی امراض کے مریضوں کا علاج تنویمی طریقوں سے کیا۔ اور فرائیڈ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اور دونوں نے مل کر عصبی امراض کا ایک مسلک کھولا۔ سنہ ۱۸۹۳ء میں انہوں نے اپنے تجربات کے نتائج بھی شائع کئے۔ لیکن بیسویں صدی میں پہنچ کر فرائڈ نے تنویم وغیرہ کا رخ ہی بدل دیا۔ اور تجزیہ النفس (سائیکو انالیسس) کا نظریہ پیش کر کے ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ جس سے نفسیاتی علاج کی نئی نئی شاہراہیں کھلیں۔ فرائڈ نے ہپناٹزم اور تنویم کو ایک آلہ تحقیق کی حیثیت سے ترک کر کے نفسی تحلیل کا طریقہ ایجاد کیا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ فرائڈ نے سب سے پہلے مسمر کے طریقے کو اپنا مشعل ہدایت بنایا تھا۔ جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ مسمر بھی تنویم کا موجد تو نہیں ہے۔ اور اس نے اس کو براہ راست فقراء اسلام سے حاصل کیا ہے۔ لیکن بہرحال مسمر نے اس کا چرچا عام کیا ہے۔ اور اس نے اس کے متعلق حقائق جمع کئے۔ اب تاریخ یہ بتاتی ہے۔ کہ ان جمع شدہ حقائق کا امتحان کیا گیا۔ اور اس کا اختتام مورٹن پرنس اور ژینے کے انکشافات سے ہوا۔ اس کے دور کے ختم ہونے کے بعد فرائڈ نے سائنسی اصولوں پر جانچ پرکھ کے اصول وضع کئے۔ فرائڈ کی پیہم کوششوں نے علاج بالتنویم کی وسعت کو اور بڑھا دیا۔ اور اس کی اس دریافت نے کہ عصبی اور ذہنی امراض کی اصل بے شعوری یا تنویم کی حالت میں ڈھونڈنا چاہیئے۔ ایک مفید طریقہ علاج کا اضافہ کیا۔

فرائڈ نے سنہ ۱۹۰۹ء میں کلارک یونیورسٹی کے طلباء کے سامنے جرمنی زبان میں لیکچر دیئے۔ اور نفسی تحلیل یا تجزیہ النفس کی وضاحت کی۔ چنانچہ فرائڈ خود اپنے الفاظ میں یہ کہتا ہے۔ کہ تجزیہ النفس کا طریقہ میری ایجاد نہیں ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ جب میں ویانا میں آخری امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ تو ایک طبیب یوسف بروئر نے اس طریقہ کو ہسٹیریا کی ایک مریضہ پر پہلی مرتبہ استعمال کیا۔ یہ ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۲ء کا واقعہ ہے۔ بروئر نے یہ دریافت کیا کہ اگر تنویمی حالت طاری کر کے ہسٹیریا کے مریض کی علامات کو دہرایا جاتا ہے۔ تو وہ علامات غائب ہو جاتی ہیں۔

غرض فرائیڈ نے تنویم کا رخ تجزیہ النفس کی طرف پھیر دیا۔ اور اس کا استعمال معالجات میں تحلیل نفسی کے سلسلے ہونے لگا۔ تنویمی عمل کی صورتیں کیا ہیں۔ اور کن کن طریقوں سے اس کے مظاہر نمودار ہوتے ہیں۔ اس کا تذکرہ آئندہ ابواب میں ملاحظہ فرمائیے۔

تنویم کا جائزہ

تنویم (ہپناٹزم) علم طب کا ایک نہایت اہم شعبہ ہے۔ لیکن جس قدر یہ اہمیت حاصل ہے۔ اُسی قدر اس سے بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ چند دماغی امراض میں اس سے حیرت انگیز فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ حاملین فن کی افسوسناک بے التفاتی نے اسے شعبدہ بازی اور دماغی تفریح کے لئے مختص کر دیا ہے۔ اس لئے اس سے جو اعلیٰ نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ اُن سے عوام کماحقہ مستفید نہیں ہو سکتے۔

طبی اہمیت دماغی امراض کے شفاخانوں (جنہیں عوام پاگل خانے کہتے ہیں) عام امراض کی تشخیص اور علاج معالجہ کے سلسلہ میں اس تسلی بخش نتائج حاصل کئے گئے ہیں۔ عمل جراحت میں تخدیر پیدا کرنے کیلئے یہ کلوروفارم کا قائم مقام ثابت ہو سکتا ہے۔ فی الحقیقت اس کے فوائد کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ صرف وہی اطباء کر سکتے ہیں۔ جو اسے باقاعدگی کے ساتھ روزمرہ کے معالجات میں برتتے ہوں۔ یہ امر نہایت ضروری ہے۔ کہ جسمانی امراض کے علاج کے متعلق اس کا استعمال صرف باقاعدہ طور پر سند یافتہ اور مسلمہ قابلیت کے ماہرین (اطباء) کو کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اگر تنویم کے ذریعے صرف علامات مرض کو دور کر دیا جائے۔ اور اصل مرض دور نہ ہو سکے۔ تو مرض کی ظاہری علامات مٹ جانے کی وجہ سے (جن سے معالج کی تشخیص میں رہنمائی ہوتی ہے) مریض کی حالت نہایت خطرناک ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک قابل معالج مریض کے جسمانی حالات کی تشخیص کے بعد اسے اپنے زیر نگرانی رکھتا ہے۔ اس صورت میں تنویم ایک بے ضرر اور مؤثر طریقہ علاج ثابت ہوگا۔ برعکس اس کے اسے برتنا اطلاء اتائیوں اور تفریح پسندوں کے لئے ایک بڑی دماغی کمزوری کے مترادف ہے۔

پُراسرار علوم کی تشریح یہ امر قابل ذکر ہے کہ عمل حاضرات (Crystal Gazing) جو آئندہ حالات معلوم کرنے کیلئے شیشے یا دوسری شفاف چیز پر نگاہ جما کر کیا جاتا ہے۔ اور روحیت (Spiritualism) یعنی زندہ اور مردہ اشخاص کے درمیان ارواحی تعلقات پیدا کرنے کا علم، طب مسیحی (Christian Science) مسیحی روحانیت کے عقیدہ سے جسمانی علاج، اعتقادی علاج (Faith Healing) روشن ضمیری یا صفائی نظری (Clairvoyance) ماورا النظر حالات اور واقعات کا مشاہدہ اور اسی قسم کے دوسرے تمام محیر العقول امور کی پوری تشریح ان مختلف واقعات کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے۔ جن کا مظاہرہ عالت تنویم میں (معمول کے ذریعہ) عامل کی مرضی اور اشارہ سے ہو سکتا ہے۔

تنویم دماغی کلید ہے تنویم۔ انسان اور دوسرے حیوانات کے دماغ کی ایسی برقی کلید ہے۔ جس سے دماغ کی تمام پیچیدہ عادتوں کے قفل آسانی سے کھل جاتے ہیں۔ اس سے انسان میں پاگل پن اور توہم کی ذہنی کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور فاتر العقل افراد کا دماغی فتور دور بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جو اثر توجہ سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ وہ توجہ سے دور بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی پاگل پن اور دماغی فتور کی اصل بنیاد کو کلیۃً دفع کرنا۔ اعلیٰ درجہ کے عمل تنویم سے رفتہ رفتہ ہی ممکن ہے۔

کامیابی کے بنیادی اصول کامیابی کے حصول کے لئے تنویم کو پوری ہنرمندی سے استعمال کرنے کے علاوہ بعض اوقات مستقل مزاجی اور ہر حالت میں سکون طبع اشد ضروری ہے۔ مریض کی پریشانی کی حالت میں اور اندرونی اعصابی امراض میں تنویم کے نتائج بہت تیز اور سریع الحصول ہوتے ہیں لیکن دماغی فتور کی حالت میں بسا اوقات بڑی قابلیت، استقلال اور مہارت فن کی ضرورت ہوتی ہے۔ گو آخر کار ہمیشہ اس محنت کی تلافی ہو جاتی ہے۔

توجہ کی کار فرمائیاں حالت تنویم میں انسان کے ذہن پر توجہ کا بے حد اثر ہوتا ہے۔ یہ امر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ہماری زندگی کم و بیش توجہ پر مبنی ہے۔ مقتضائے زمانہ کے مطابق جو معاشرتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ وہ اسی کا کرشمہ ہیں۔ ہماری وقت کے ساتھ بدلنے کی کوشش توجہ کی بدولت ہے۔ غرض ہم غیر شعوری طور پر دوسروں کی توجہ پر عمل کرتے ہیں۔ جسے غیر توجہی (Suggestion) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ کسی چیز کے فوائد کے متعلق تخیل راسخ کر دینے کے بعد صرف پانی دینے سے ہی وہ اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ جن کا مریض کو قبل از یقین دلایا گیا ہو۔ اس قسم کے واقعات کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ کہ سادہ لوح دیہاتی مریض نے بازار سے دوائیں لینے کی بجائے طبیب کے نسخہ کا کاغذ ہی پی لیا۔ اور اسے مطلوبہ فوائد حاصل ہو گئے۔ بالعموم پیٹنٹ دواؤں کے متعلق بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ کہ جب کسی دوا کے مفید ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ تو اس کے مشتہر شدہ فوائد حاصل ہو جاتے

ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اہم مستثنیات ضرور ہیں ۔ مگر وہ حقائق پر اثر انداز نہیں ہوتے ۔ اور یہ تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ۔ کہ تنویمی توجہ کا کوئی دوسری چیز مقابلہ نہیں کر سکتی ۔ یہ ایسی کلید ہے ۔ جس سے ذہن انسانی پر پوری قدرت حاصل کی جا سکتی ہے ۔

تعریف تنویم کہتے ہیں ۔ اُس دماغی کیفیت کے پیدا کر دینے کو جس میں توجہ کے تدریجے اثرات کو قبول کرنے کی استعداد اور توجہ سے جو اثرات پیدا کئے گئے ہوں ۔ ان پر عمل کرنے اور انہیں سرانجام دینے کی طاقت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے ۔

معمول کی توجہ کو منعطف کرنے کی وجہ دماغ جس قدر یکسو اور تخیل سے خالی ہوگا ۔ خیالات کو ایک مقررہ شاہراہ کی طرف رجوع کرنے میں اُسی قدر آسانی ہوگی ۔ اگر ہماری توجہ کوئی کام نہیں کر رہی ۔ تو اس کے کام میں لانے والی ہلکی اور خفیف تحریک کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے نظام عصبی پر نیم بیکاری ' اور نیست تعطل ' کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ اور ایک قسم کی غنودگی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے ۔

تنویم کیسے اثر کرتی ہے معمول کی توجہ کو کسی خاص روشن چیز مثلاً مخطاو العین (جو معمول کی آنکھ سے ایک فٹ کے فاصلے اور خط نظر سے ایک فٹ کی بلندی پر ہو اور جس کے شیشے سے منعکس ہونے والی روشنی نہایت تیز ہو) کی طرف قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آنکھ میں ماحول کے مطابق تغیر و تبدل پیدا کر کے کام کرنے کی جو طاقت قدرت نے ودیعت کی ہے ۔ اس پر زور ڈال کر بصارت کو تھکایا جائے ۔ کچھ دیر بعد زور کا یہ اثر ہوتا ہے ۔ کہ پتلی پھیل جاتی ہے ۔ اور نظر میں دھندلا پن پیدا ہو جاتا ہے ۔ اور پلکوں کو زیادہ دیر تک سیدھا کھلا رکھنے کی وجہ سے ان میں گرانی کا احساس ہونے لگتا ہے ۔ ایسی حالت میں جب سُریلی آواز سے اشارتی لفظوں میں یہ توجہ دی جائے ۔ کہ آنکھیں تھکنے لگی ہیں ۔ اور نظر دھندلی ہو رہی ہے ۔ تو علم الحیات کے اصول کے مطابق توجہ کا اثر شروع ہو جاتا ہے ۔ جب آنکھیں تھکی ہوئی ہوتی ہیں ۔ تو قدرتی طور پر انہیں بند کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے ۔ اور معمول نیند کی طرف مائل ہو جاتا ہے ۔ اس وقت معمول کے اعصاب بیرونی تحریکات سے خالی ہوتے ہیں ۔ اور عامل اپنی سُریلی آواز سے نیند کی توجہ دے رہا ہوتا ہے ۔ اس لئے یہ تمام امور معمول کو تیزی کے ساتھ نیند کی طرف کھینچتے ہیں ۔ اور وہ سو جاتا ہے ۔ نیند کا ایسا ہی غلبہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص غیر دلچسپ اور ادق کتاب پڑھتا ہے ۔

تنویمی نیند کی اقسام تنویمی نیند تین طرح کی ہو سکتی ہے (۱) ہلکی (۲) گہری (۳) بہت گہری (جسے خواب گراں —— Somnambulism کہتے ہیں) ہو سکتی ہے ۔ ہلکی اور گہری نیند تقریباً معمولی نیند کی سی ہوتی ہے ۔ لیکن خواب گراں معمولی نیند سے بالکل مختلف ہے ۔ معمولی نیند میں سوئے ہوئے انسان سے اگر بات کی جائے ۔ تو اعصاب سامعہ کے ذریعے آواز کا محرکہ اثر دماغ تک پہنچتا ہے ۔ جس سے انسان جاگ اٹھتا ہے ۔ لیکن خواب گراں کی حالت میں سوئے ہوئے شخص سے اس کی نیند میں کسی قسم کا خلل ڈالے بغیر بات کی جا سکتی ہے ۔ یہی نہیں بلکہ اس کا اثر معمول کی نیند پر خوشگوار ہوتا ہے ۔

معمولی نیند اور تنویمی نیند میں تفاوت معمولی نیند میں سوئے ہوئے انسان کا تعلق اس کے ذاتی اندرونی احساس سے ہوتا ہے اور اس کے برعکس خواب گراں کی حالت میں اس کا رابطہ (Enrapport) بیرونی دنیا کے ساتھ ہوتا ہے ۔ خواب گراں کی حالت میں انسان کے کم و بیش تمام احساسات معطل ہو جاتے ہیں ۔ اور اس وقت تک کم و بیش اسی حالت میں رہتے ہیں ۔ جب تک عامل انہیں اپنا فعل انجام دینے کی ہدایت نہ کرے ۔ معمولی نیند تکان اور عادت سے پیدا ہوتی ہے ۔ اور اسی حالت میں نظام جسمانی کا فعل مرمت کی غرض سے بند رہتا ہے ۔ اس لئے جیسے ہی مرمت کا کام ختم ہو جاتا ہے ۔ ویسے ہی معمولی انسان تر و تازہ ہو کر بیدار ہو جاتا ہے ۔ حالت تنویم کسی وقت بھی طاری کی جا سکتی ہے ۔ خواہ اس سے قبل نظام جسمانی میں معمولی نیند سے جو قوت فراہم ہو چکی تھی ۔ اس میں استعمال کی وجہ سے نمایاں حد تک کمی ہو چکی ہو یا نہیں ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے ۔ کہ مصنوعی طور پر پیدا کی ہوئی نیند یعنی حالت تنویم میں قوت کے اجتماع کی بہت زیادتی ہو جاتی ہے ۔ جسے عامل ایک مرکز پر لا کر جس طرف چاہے رجوع کر سکتا ہے ۔

سا ابنا سلل کے فالج میں فائدہ کیسے ہوتا ہے معمولی قسم کے حسی اعصابی اثر کے مقابلے میں اس اعصابی قوت کو جو ایک مرکز پر جمع کر کے ایک خاص طرف تیزی کے ساتھ رجوع کی جائے ۔ نظام جسمانی پر بقدر ثابت زیادہ قوت کے ساتھ اثر انداز ہو جانا چاہیئے ۔ اس سے گرمی کے اس احساس کی توجیہ ہو جاتی ہے ۔ جو جسم کے کسی حصہ میں توجہ مرکوز کرنے سے پیدا ہو جاتا ہے ۔ اور اس میں فوری اجتماع خون ہو جاتا ہے ۔ اس مثال سے اس کامیابی کی بھی وضاحت ہوتی ہے ۔ جو سا ابنا سلل کے کیس فالج کے علاج کی بعض صورتوں میں ہوا کرتی ہے ۔ اس حالت میں توجہ کو حکم کی طاقت حاصل ہو جاتی ہے ۔ اور مریض مجبور ہو جاتا ہے ۔ کہ اعضاء اعصاب کے سرا ایک حصہ پر اپنا انتہائی زور ڈالے ۔ کہ وہ اس حکم پر عمل کریں ۔ یہ توجہ بالکل ٹھیک

اور صحیح طور پر اپنی جگہ پہنچتی ہے۔ اور خیال رہنمائی کرتا ہے۔ کہ عمل کی صورت میں اس کی پوری تعمیل کی جائے۔ چنانچہ جب مریض کو کہا جاتا ہے۔ کہ اس مفلوج عضو کو حرکت میں لاؤ یا مہینوں کے مرض افونیا ([illegible] آواز کا بند ہو جانا) کے باوجود بات کرو۔ تو دیکھا جاتا ہے۔ کہ وہ عامل کی توجیہ یا ہدایت پر عمل کرنے کی انتہائی کوشش کرتا ہے۔ (یہاں توجیہ کی بجائے ہدایت (Direct Suggestion) بہتر اصطلاح معلوم ہوتی ہے) اس امر کا بارہا مشاہدہ ہو چکا ہے۔ کہ لکنت کے مریض حالت تنویم میں ایسی انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ کہ وہ اس لکنت سے صاف اور بہتر بولنے لگتے ہیں۔ اسی طرح بہت آدمی کانا پھوسی بھی سن لیتے ہیں۔ در اصل توجیہ کا اثر نیند کے گہرے یا ہلکے ہونے پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ اس کا انحصار اس امر پر ہے۔ کہ عامل جن خیالات کی توجیہ دے رہا ہے۔ ان کو قبول کرنے اور اس کے ساتھ ہی دیگر تمام مخالف اثرات کو کلیتاً فراموش کر دینے کی صلاحیت بہت زیادہ ہونی چاہیئے۔ یہ حالت تنویم کے بغیر بھی بدرجۂ اتم پیدا کی جا سکتی ہے۔

تنویم ہر شخص پر کی جا سکتی ہے یہ صحیح ہے کہ نوع انسان کے تقریباً نصف حصہ ہی کو تنویم کے ذریعہ خواب گراں کی حالت تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس حالت میں عامل کی باتوں کا جواب معمول اس کی ہدایت کے مطابق دیتا ہے۔ خواہ یہ سوالات ایسے دور افتادہ مقامات سے متعلق ہوں۔ جہاں معمول کبھی نہ گیا ہو۔ یہ ممکن ہے۔ کہ عامل جن کے متعلق سوال کرے۔ معمول ان کی نقل کر کے دکھا دے۔ ایسی حالت میں توجیہ مابعد (Post Hypnotic Suggestion) دی جا سکتی ہے۔ جس میں معمول حالت تنویم رفع ہونے کے بعد وقت معینہ پر عمل کرتا ہے۔ نوع انسان کے تین چوتھائی حصے کو گہری نیند کی حد تک بےحس کیا جا سکتا ہے۔ اور قریباً ہر شخص پر ہلکی نیند یعنی ابتدائی درجہ طاری کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں۔ جو ابتدائی درجہ میں اس امر سے منکر ہوئے ہیں۔ کہ وہ تنویم کے زیر اثر ہیں۔ کیونکہ بیرونی دنیا کے واقعات سے ان کا تعلق قائم رہتا ہے۔ تاہم اس ابتدائی درجہ میں بھی جو توجیہ دی جاتی ہے بسا اوقات اس کا اثر زور دار اور پائیدار ہوتا ہے۔ جو شخص اس اثر کو تسلیم نہ کرے۔ اسے قائل کرنے کیلئے کہیں کہ آنکھیں نہیں کھول سکتے۔ معمول کو یہ جان کر حیرت ہوگی۔ کہ واقعی وہ عامل کے حکم کے بغیر آنکھیں نہیں کھول سکتا۔ اس امر کے معلوم کرنے کیلئے کہ آیا تنویمی توجیہ اچھا نتیجہ پیدا کرے گی اور بار آور ثابت ہوگی۔ ابتدائی درجہ میں ایک طریقہ یہ ہے۔ کہ عامل درد کی جگہ ہاتھ پھیرے یا زیر ناف پیٹ کے نیچے مالش کرے۔ اور کہے کہ ان مقامات میں حرارت بتدریج ترقی کر رہی ہے۔ معمول اس مقام پر حرارت کی پیدائش کو محسوس کرے گا۔ جس کا صحیح اندازہ آلہ مقیاس الحرارت (تھرمامیٹر) سے کیا جا سکتا ہے۔

مظاہرِ تنویم

لاشعور

نفس کے متعلق جو حقائق ہمیں معلوم ہیں۔ ان میں مسمر کی کارکردگی کو بڑا دخل ہے۔ اس کی تحقیقات نفسیاتِ جدید میں اساسی حیثیت کی مالک ہے۔ اس بنا پر تحلیل نفسی یا تجزیہ نفس (Psycho-analysis) کی عمارت استوار کی گئی۔ لاشعور کے تعارف کو شرف ایک حد تک مالٹین مقناطیسیت کو حاصل ہے۔ لیکن اس کے متعلق اصل کام ماہر سگمنڈ فرائیڈ نے کیا۔ اس سے پہلے ذہن کی تقسیم مختلف صلاحیتوں کے مطابق کی جاتی تھی۔ لیکن فرائیڈ نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچائی۔ کہ نفس (Psyche) ایک وحدت ہے۔ جس کے دو رخ شعور (Conscious) اور لاشعور (Unconscious) ہیں۔ اور قبل شعور (Pre-conscious) شعور کا کنارا ہے۔ فرائیڈ نے نفس کو تین گروہوں میں تقسیم کر کے اس کا سمجھنا آسان کر دیا ورنہ اس کی تعریف کارے دارد ہے۔ فی الحقیقت نفس ان چیزوں میں سے ہے۔ جنہیں ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن صحیح طور پر الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتے۔ چنانچہ اس کی جامع تعریف ابھی تک نہیں کی جا سکی۔

ہم گفتگو اور تحریر کے ذریعے جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں ہمیں ان کا شعور ہے۔ کاغذ، قلم وغیرہ ان سب کا ہمیں شعور ہے انہیں نفس میں لانے کے لیے ہمیں کسی کوشش کی ضرورت نہیں۔ ماسبق قبل شعور نفس کا وہ حصہ ہے۔ جہاں ایسے خیالات ہوتے ہیں۔ جو آسانی سے شعور میں آجاتے ہیں۔ اسے عام یادداشت سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ لاشعور نفس کا وہ حصہ ہے۔ جس کے مشمولات شعور کی دسترس میں نہیں ہوتے۔

نفس کی وسعت میں شعور سے کہیں زیادہ لاشعور کی کارفرمائی ہے۔ شعور اس کا ایک ادنیٰ حصہ ہے۔ جس کی قوت کا انحصار بالآخر شعور پر ہی ہے۔ لاشعور میں انسانی استعداد، خواہشات، خیالات اور یادداشتیں مخفی ہیں۔ گو ان کا ادراک ہمارے شعور کو کبھی بھی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ہمارے فکر و عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی انسان کے اخلاق، کردار اور افکار پر ضبط رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں وہ ذہنیتیں اور مصائب بھی پنہاں ہیں۔ جو انسان کے بارہ گوشہ تخت تک جاتے ہیں۔ فرائیڈ اور دوسرے ماہرین نے لاشعور کے متعلق خوب داد تحقیق دی ہے۔ جس کے نتیجہ میں چند در چند قابل قدر امور دریافت ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود ہم اس سرزمین کے کنارے پر کھڑے ہیں۔ فی الحقیقت لاشعور کی اپنی زبان ہے۔ جسے اشاریت (Symbolism) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کا سمجھنا دشوار ہے۔ لیکن ناممکن نہیں ہے۔ شعور اس زبان کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ مستزاد یہ کہ وہ حتی الوسع لاشعور کے پیغاموں کو اپنی حدود میں داخل ہونے سے روکتا ہے۔ لیکن وہ اس کوشش میں ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتا۔ اور لاشعور نا آسودہ خواہشوں کو دوسرا جامہ پہنا کر دھوکے سے شعور میں بھیج دیتا ہے۔ اس کی سب سے آسان صورت خواب ہیں۔ کیونکہ نیند کے دوران میں شعور کی نگرانی کمزور ہو جاتی ہے۔ اس لئے خواب میں اشاریہ یعنی شعور کی زبان زیادہ چلتی ہے۔

ہر روز ہم جو کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں۔ اسے وقت کے ساتھ بھولتے جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر یہ سب کچھ شعور میں رہے۔ تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جسے ہم بھولنا کہتے ہیں۔ وہ حقیقت میں شعور سے لاشعور میں جانا ہے۔ جہاں وہ اسے محفوظ کر لیتا ہے۔ جو باتیں شعور میں چلی جاتی ہیں۔ ان میں بھی فرق ہے۔ بہت سی معمولی سی کوشش سے شعور میں آجاتی ہیں۔ بعض کسی مناسب وقت پر شعور میں آتی ہیں۔ مثلاً ہم کسی شناسا سے ملتے ہیں۔ تو یہ خیال آتا ہے کہ اس کا تعارف کس نے کرایا تھا؟ اور ایک عزیز ترین دوست کا خیال آجاتا ہے۔ جس سے ملے مدت ہو چکی ہے۔ پھر اس سے متعلق واقعات کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان کا تعلق لاشعور سے ہے۔ جسے ہم قصداً فراموش کر دیتے ہیں۔ اور

سخت کوشش کے باوجود ہم انہیں یاد نہیں کر سکتے۔ یہ باتیں کسی طرح شعور میں آنے کا نام نہیں لیتیں۔ ان میں نا آسودہ خواہشات اور ناخوشگوار واقعات شامل ہیں۔ جنہیں شعور سے لاشعور میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ ہر چند شعور انہیں اپنی حدود میں داخل ہونے سے روکنے کے لئے ان پر احتساب بٹھا دیتا ہے۔ پھر بھی یہ بھیس بدل کر وارد ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی نا آسودہ خواہش یا صدمہ اس شکل میں آتا ہے۔ تو شعور کو معلوم نہیں ہوتا کہ ایسا کوئی واقعہ ہوا بھی تھا۔ اس سے گوناگوں ذہنی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ اور جسمانی تکلیف بھی ہو سکتی ہے۔ تنویم اور تحلیل نفسی سے ان واقعات کو دہرایا جا سکتا ہے۔ اور بچپن کے حالات بھی شعور میں لائے جا سکتے ہیں۔

حالتِ تنویم کی نیند سے نسبت

حالتِ تنویم نیند سے اتنی قریبی نسبت رکھتی ہے۔ کہ اسے مصنوعی نیند کہا جا سکتا ہے۔ بعض پہلوؤں سے یہ نیند سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن دوسرے پہلوؤں سے حد درجہ مشابہ ہے۔ ایک اہم فرق یہ ہے۔ کہ اسے ذہن کے کسی حصہ میں ماہرِ تنویم اپنے ذاتی اثر سے پیدا کر سکتا ہے۔ پھر اس کا تعلق تکان یا دماغ کی فعلیاتی تبدیلیوں سے نہیں ہے۔ جو نیند کے لئے ضروری ہیں۔ حالتِ تنویم میں شعور کسی وقت بھی بالکل بے خبر نہیں ہوتا۔ خواہ بیدار ہو کر حالتِ تنویم کے واقعات فراموش ہی ہو جائیں۔ اس امر کا بڑا ہی ثبوت یہ ہے کہ معمول، عامل کے احکام پر دورانِ تنویم میں اور اس کے بعد بھی عمل کرتا ہے۔ طبعی نیند ایسی گہری ہوتی ہے۔ کہ اس میں کوئی بات نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی تنویم کے مظاہر کو عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ نیند میں جو خواب دکھائی دیتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کو خواب خرامی (نیند میں چلنا) کا جو مرض ہوتا ہے۔ اس میں حالتِ تنویم سے مشابہت کا اہم پہلو ہے۔ خواب خرامی کا مریض نیند میں اٹھ کر چلتا پھرتا ہے۔ اور اس حالت میں کئی ایک عجیب اور بعض اوقات خطرناک کام کر جاتا ہے۔ لیکن جب وہ بیدار ہوتا ہے۔ تو اسے یہ باتیں بالکل یاد نہیں رہتیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان دونوں حالتوں میں قویٰ بہت سریع ہو جاتے ہیں۔ جس سے انسان ایسے کام کر گزرتا ہے۔ جو اس کے امکان سے باہر ہوتے ہیں۔

اگر معمول پر گہری تنویمی حالت طاری کر کے اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو طبعی نیند سے اس کے سوا کوئی تفاوت باقی نہیں رہتی۔ کہ کچھ دیر تک اس کا عامل سے رابطہ باقی رہتا ہے۔ یعنی وہ عامل کے اثرات کو قبول کر کے ان کا جواب دیتا ہے۔ معمول کو تنہا رہنے دیا جائے۔ تو رابطہ بھی بتدریج ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس کی حالت طبعی نیند سونے والے کی مانند ہو جاتی ہے۔ بعد ازاں کچھ دیر سو کر وہ از خود بیدار ہو جاتا ہے۔

پروفیسر میکڈوگل نے حالتِ تنویم سے نیند کی نسبت کے متعلق یہ توجیہہ کی ہے کہ "رابطہ کے دوران میں معمول عامل کے ہر لفظ، لمس یا اشارے کا جواب دیتا ہے اور عام طور پر نہایت حساس ہوتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ طبعی نیند سونے والے کی طرح دوسرے احساسی ارتسامات کو وصول نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک مثالی گہری تنویمی حالت وہ نیند ہے جو عامل اور معمول کے درمیان رابطہ کی وجہ سے متغیر ہو جاتی ہے۔"

تنویم اور اثر پذیری

تنویم کی اثر پذیری کے متعلق ماہرین میں اختلاف ہے۔ ایک فریق بجز تنویمی اثر کو تنویم قرار نہیں دیتا۔ اس لئے اس کا تناسب دس فیصدی سے زائد نہیں ہے۔ لیکن دوسرا اس کے برعکس انہیں اثر پذیری میں داخل کرتا ہے۔ اس سے صرف چند فیصدی لوگ اس کے دائرہ سے باہر رہ جاتے ہیں۔ گہرا تنویمی اثر قریباً ایک چوتھائی لوگوں پر طاری ہوتا ہے۔ تنویم کے ساتھ قومیت، جنس اور عمر کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اکثر ماہرین کا خیال ہے کہ عورتوں اور بچوں پر جلد تنویم طاری کی جا سکتی ہے۔ اس طرح اختناق الرحم کے مریض بھی سرعت سے اثر پذیر ہو جاتے ہیں۔

درجاتِ تنویم

تنویمی اثر کے مختلف مدارج ہیں۔ شارکٹ نے اسے تین درجوں میں تقسیم کیا ہے :-

پہلا درجہ **غنودگی** - اس میں علاج کیلئے توجیہات دی جا سکتی ہیں۔

دوسرا درجہ **سکوت** مریض سے کہا جائے کہ اس کے اعضاء سخت ہو گئے ہیں۔ تو وہ واقعی سخت ہو جاتے ہیں۔

تیسرا درجہ **خوابِ گراں** اس میں مریض کو توجہ مابعد دی جاتی ہے۔

ماہر شارکٹ کی رائے میں یہ تینوں حالتیں درجہ بدرجہ پیدا ہوتی ہیں۔ اور عامل کی خواہش کے مطابق ایک یا دوسری حالت لازمی طور پر پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کی رائے میں صرف وہ لوگ اثر پذیر ہو سکتے ہیں۔ جن میں اختناق الرحم کے جراثیم ہوں۔

ڈاکٹر ببیا آلٹ نے تنویم کے چھ درجے کئے ہیں :-

پہلا درجہ معمول پلکوں میں گرانی، تمام بدن میں ڈھیلا پن اور غنودگی محسوس کرتا ہے۔

دوسرا درجہ اس حالت میں اگر عامل، معمول کے بازو کو ایک خاص مقام پر قائم کر دے۔ اور حکم دے کہ "یہ اسی جگہ رہے" تو معمول کے لئے یہ ممکن نہیں رہتا۔ کہ اسے کسی طرف حرکت دے۔ اس مقام پر بازو لکڑی کی طرح سخت ہو جاتے ہیں۔ اور اس حالت میں اتنی دیر تک رہتا ہے کہ طبعی حالت میں انسان اس کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ پہلے اور دوسرے درجے میں انسان کو تقریباً پورا ہوش ہوتا ہے۔ ان مدارج میں معمول اکثر اس بات سے انکار کرتا ہے۔ کہ وہ اثر پذیر ہو چکا ہے۔ کیونکہ جو بات اس سے کہی جائے۔ وہ اُسے سنتا ہے۔ اور ہر ہر لفظ یاد رکھتا ہے۔

نوعِ انسان کی ایک بڑی تعداد کو اس سے زیادہ اثر پذیر نہیں کیا جا سکتا۔

تیسرا درجہ معمول کے گرد و پیش جو کچھ ہو رہا ہو اس کا اسے ایک خاص حد تک علم رہتا ہے۔ اور اس سے جو بات کہی جائے اس کا ہر لفظ سنتا ہے۔ لیکن اس پر گہری نیند غالب ہوتی ہے۔ اور اس کے جسم کا عضو عضو بے کار ہو جاتا ہے۔ اُسے وہ خود بخود مشین کی طرح جاری رکھتا ہے۔ اگر ایک بازو کو چکر دیا جائے۔ تو اُسے وہ اس وقت تک گھماتا رہتا ہے۔ جب تک کہ اُسے روکا نہ جائے۔

چوتھا درجہ مریض کا تعلق بیرونی دنیا سے ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ کلیتاً عامل کے اقتدار میں آ جاتا ہے۔ جو کچھ عامل کہتا ہے۔ وہ صرف اسی کو سنتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں سنتا۔

پانچواں اور چھٹا درجہ یہ خوابِ گراں کی حالت ہے۔ اس کے دوران میں جو کچھ ہوتا ہے۔ اس کا نقش مدھم قائم رہتا ہے۔ اسے یاد دلانے کے لئے بڑی جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ چھٹے درجے میں جو کچھ ہوتا ہے۔ معمول کو بالکل یاد نہیں رہتا۔ اس میں توجہ مابعد دی جاتی ہے۔ اور مریض اُن پر عمل کرتا ہے۔

تنویم اور حیوانات

کچھ عرصہ ہوا کہ اخبارات میں ایک دلچسپ خبر نظر سے گزری۔ کہ ایک سادھو جی مہاراج جو دہلی کے چڑیا گھر میں پہرہ داروں کی نظر بچا کر شیر کے پنجرہ میں داخل ہو گئے۔ شیر پہلے تو انہیں دیکھ کر غرایا۔ لیکن جب سادھو جی نے اس کی پرواہ کئے بغیر آسن جما لیا۔ تو وہ پالتو جانور کی طرح دُم ہلانے لگا۔ پہرہ داروں نے سادھو جی سے منت کی کہ باہر آ جائیں۔ لیکن وہ باہر نکلنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ آخر بڑی جد و جہد کے بعد شیر کو دوسرے پنجرے میں کر کے سادھو مہاراج کو نکالا گیا۔

بعض ماہرین تنویم کا خیال ہے۔ کہ جانوروں کو بھی اثر پذیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ خیال نیا نہیں ہے۔ بلکہ حامیین مقناطیسیت کی بھی یہی رائے تھی۔ ایک عامل مقناطیسیت نے دعویٰ کیا تھا کہ ایک شیر پر عمل کرنے میں کامیابی ہوئی ہے۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ جانوروں میں تنویم کے مظاہر پیدا ہو جاتے ہیں جنہیں تحت لایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر جیرالڈ یو (Gerald yeo) نے

اس کے متعلق دلچسپ تجربات کئے ہیں۔ فی الحقیقت جانوروں کی نظر کو ایک خاص طرف قائم کرتے اور ان کے جسم پر ہاتھ پھیر کر ان پر آسانی سے تنویم طاری کی جا سکتی ہے۔ کرچر (Kircher) نے مرغ (Rooster) کے متعلق جو تجربہ کیا ہے۔ وہ اس کی عام ترین مثال ہے۔ اگر ایک لکیر کھینچ کر فاول کی چونچ چند سیکنڈ کے لئے اس کے ساتھ لگا دی جائے۔ تو وہ کئی منٹ تک اسی حالت میں پڑا رہتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر آیڈ کی رائے ہے۔ کہ اس منظر میں لکیر کھینچنا غیر ضروری ہے۔ ڈاکٹر رالف ونسنٹ (Ralph Vincent) نے بھی اثر پذیر بطخوں، خرگوشوں اور دوسرے جانوروں پر مختلف تجربات کئے ہیں۔

جو مرغی انڈوں پر بیٹھی ہوئی ہو۔ اس کی جگہ بدلنے کے طریقہ سے مرغیاں پالنے والے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ فی الحقیقت اس کی کامیابی کا انحصار بھی تنویم پر ہے۔ اس عمل میں مرغی کے سر کو اس کے بازو کے نیچے چند منٹ تک نرمی سے دبا کر رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے پہلی جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ اور اسے نقل مکانی کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اکثر جانوروں کے ماتھے کو اگر آہستہ آہستہ سہلایا جائے۔ تو غنودگی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی کیفیت جنوبی امریکہ کے اصلی باشندوں میں دیکھی جاتی ہے۔ ان کی بیویاں ان کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہیں۔ جن سے ان پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے وہ بہت شائق ہیں۔

شیر، چیتا اور سانپ وغیرہ اپنے شکار کو ایک طرح اثر پذیر بھی کرتے ہیں۔ یعنی جانور جیسی حرکت ہو کر اپنی جگہ سے چلنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ اور وہ اسے لقمہ بنا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بعض اژدہا ایسے ہیں۔ جن کی طرف شکار خود بخود کھنچا چلا آتا ہے۔

صورت پذیری

حالتِ تنویم کا ایک خاص مظہر صورت پذیری ہے۔ جسے توجہ سے یا اس کے بغیر بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس حالت میں معمول کے بازو، انگلیوں اور ہاتھ کو جس صورت میں چاہے رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً بازو کو اٹھا کر خواہ کسی زاویہ میں کھڑا کر دیا جائے۔ تو چھوڑ دینے پر بھی وہ بدستور اسی حالت میں کھڑا رہتا ہے (یہ سکتہ کے مرض کی خاص علامت ہے) اگر عامل ایسا نہ ہو سکے تو عامل کیلئے صرف اسقدر کافی ہوتا ہے۔ کہ وہ بازو کو پکڑ کر اٹھائے۔ اور توجہ دے۔ کہ یہ اسی طرح کھڑا رہیگا۔ اس کے بعد بازو یقیناً اسی حالت میں رہیگا۔ اس امر کو اصطلاح میں موم کی مانند صورت پذیری (Waxy flexibility) کہا جاتا ہے۔ گہری حالتِ تنویم کی اس سے بڑھ کر کوئی صحیح علامت نہیں ہوتی۔ اگر معمول اس درجہ کو نہ پہنچا ہو۔ تو وہ اس حالت کو قائم رکھ سکتا ہے۔ لیکن اس کی صورت ناقص ہوتی ہے۔ صورت پذیری کے حصول کے بعد معمول کا بازو ایسے نرم تار کی طرح ہو جاتا ہے۔ جسے جس طرف موڑا جائے۔ وہ اسی حالت میں قائم رہے۔ معمول بازو کو اپنی مرضی سے کوئی حرکت نہیں دے سکتا۔ اگر بازو کو نصف گھنٹہ تک بھی اسی حالت میں رہنے دیں تو بھی معمول کو تکان محسوس نہیں ہوتی۔ صورت پذیر عضو ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ اگر اسے دھکا دیا جائے۔ تو یہ اسی حد تک گرتا ہے۔ جس حد تک اسے دھکا دیا گیا ہو۔ اسے تھوڑی دیر تک مسلسل گھمایا جا سکتا ہے۔ جتنی زیادہ دفعہ کسی معمول پر عمل کیا گیا ہو۔ اسی قدر جلد وہ عامل کی توجہ سے متاثر ہو کر ان پر عمل پیرا ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات ہسٹیریا کے مریضوں میں سکوت کی یہ حالت، حالتِ تنویم کے بغیر خود اپنے ہی اثر سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور اس پر توجہ پورا اثر کرتی ہے۔

زندگی کے روزانہ بازاروں میں جمود کے مظاہر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس امر کا عام طور پر مشاہدہ کیا گیا ہے۔ کہ باتیں کرتے ہوئے اگر کسی مریض کا ہاتھ یا بازو کھڑا کر دیا جائے۔ تو وہ سہارا ہٹا لینے کے بعد بھی اسی طرح کھڑا رہتا ہے۔ ہاتھ اٹھانے کا یہ فعل مریض کے لاشعور پر یہ توجہی اثر ڈالتا ہے۔ کہ وہ اسے اٹھائے رکھے۔ ماہرینِ تنویم کا متفقہ فیصلہ ہے۔ کہ نوے فیصدی لوگ اپنے بدن کو ڈھیلا کرنا نہیں جانتے۔ اور شاذ ہی وہ کبھی اپنے بدن کو ڈھیلا کر کے آرام دیتے ہیں۔ نیند میں البتہ بدن خود بخود ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ عوام اس بات سے اس حد تک ناواقف ہوتے ہیں۔ کہ بتانے کے باوجود وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ بدن کے ڈھیلا کرنے کے معنی یہ ہیں۔ کہ اگر کسی شخص کا ہاتھ یا بازو تھام کر اس سے یہ کہا جائے۔ کہ "وہ اپنی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت نہ کرے اور عامل اسے جس طرف چاہے موڑے۔ اسے حرکت دے۔" ایک عام شخص کبھی ایسا نہیں کر سکیگا۔ اگر وہ خود ایسا کرنا چاہے بھی تو بازو کی طرف سے خود بخود مزاحمت پیدا ہو جائیگی۔ مثلاً اگر بازو کو اونچا اٹھایا ہوا ہو تو اپنے ہاتھ کا سہارا لیکا یک ہٹا لینے سے وہ کچھ وقت کیلئے وہیں کا وہیں کھڑا رہے گا۔ یا اسے نیچے لے گرنے میں بازو کی طرف سے کچھ نہ کچھ مزاحمت ضرور ہوگی۔

سکوت کی ایک اور علامت روزمرہ زندگی میں اکثر دیکھی جاتی ہے۔ جب انسان جذبات کی گرفت میں آ جائے۔ خواہ یہ حالت چند لمحے

کھیتے ہی رہے۔ مثلاً ایک شخص کسی کام میں مصروف ہے۔ اچانک کسی خیال کے آتے ہی وہ اس حالت میں بے حس و حرکت کھڑے کا کھڑا یا بیٹھے کا بیٹھا رہ جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے۔ کہ کوئی نہایت نازک امر درپیش ہوتا ہے۔ لیکن انسان خوف سے ایسا مفلوج ہو جاتا ہے۔ کہ اسے کچھ کرتے بن نہیں پڑتا۔

جس طرح حالت تنویم میں صورت پذیری پیدا کی جا سکتی ہے۔ ویسے ہی اعضا کو جنبش یا عدم جنبش کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جس عضو پر اس امر کیلئے توجہ دی جائے۔ وہ جنبش اور حس ہو جاتا ہے۔ اور کوئی فعل سرانجام نہیں دے سکتا۔ بسا اوقات صورت پذیری ایسی اللازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی اس کا ظہور بعد میں ہوتا ہے۔ مثال کسی کی حالت میں معمول کی پلکیں بند کر کے اسے حکم دیا جائے۔ کہ وہ انہیں نہیں کھول سکتا۔ تو وہ فی الحقیقت انہیں کھولنے سے معذور ہو جاتا ہے۔

حالتِ تنویم کے عمیق تر درجے

گہری حالتِ تنویم کے بعد 'بعد تنویمی نسیان' ہوا کرتا ہے۔ لیکن صورت پذیری میں ہو سکتا ہے۔ کہ معمول کو تمام امور کا علم ہوتا رہے۔ اور وہ تنویمی اثر کے بعد انہیں بیان کرے۔ اس لئے صورت پذیری اس امر پر دال نہیں ہوتی۔ کہ معمول حالتِ تنویم کے عمیق درجے میں پہنچ چکا ہے۔ تنویم کا یہ درجہ بعض معمولوں میں خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بعض میں توجہ سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔

گہری حالتِ تنویم میں معمول کی ادراکی اور مدرکہ قوتیں عامل کی توجہ کے زیر تحت آ جاتی ہیں۔ اس حالت میں عامل بہ آسانی معمول کے اعضا و جوارح میں کئی قسم کے حسی اور ذائقے کے اعراض پیدا اور رفع کر سکتا۔ اور بہت متنوع مغالطات ([illegible]) اور منفی اوہام (Negative [illegible]) پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ان اشیا کو دیکھے اور ان باتوں کو سنے جن کا کوئی وجود موجود ہی نہ ہو۔ وہ لغو باتوں کو تسلیم کر لیتا۔ اور ایسی حرکات کا مرتکب ہوتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ ان پر یقین رکھتا ہے۔ اس حالت میں عامل اس کے حواس خمسہ پر بھی متصرف ہوتا ہے۔ اور اسے دیکھنے، سننے، چکھنے اور سونگھنے سے محروم کر سکتا ہے۔ یہ قوتیں عامل کے منشا کے مطابق اور جس حد تک وہ چاہے عمل کرتے ہیں۔ اگر عامل حکم دے۔ تو معمول تیز امونیا کو بھی گلاب سمجھے گا۔ کہ اس میں مطلق بو نہیں ہے بخت تلخ چیز کو پی کر کہہ دیتا ہے۔ "یہ بے ذائقہ ہے۔" کمرہ میں کوئی چیز یا شخص موجود ہو اور عامل کہے کہ "یہ موجود نہیں ہے۔ تو وہ اسے نظر نہیں آتی۔ سادہ پانی کا گلاس یہ کہہ کر دیا جائے کہ اس میں شراب ہے۔ تو وہ اسے شراب سمجھ کر پیئے گا۔ اس سے بھی بڑھ کر اگر عامل اسے شراب کا فرضی گلاس پیش کرے۔ تو وہ اسے بڑی سنجیدگی کے ساتھ تھامے گا۔ اور ہاتھ میں وزن محسوس کریگا۔ اور اس طرح پیئے گا۔ گویا شراب پی رہا ہے۔ اس حالت میں معمول مختلف قسم کے کرداروں کو ایک اداکار کی سی خوبی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ مثلاً اس سے کہا جائے۔ کہ وہ چھ سالہ بچہ ہے۔ تو وہ ناسمجھ بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ اور اپنے ہم عمر بچوں سے کھیلنے لگتا ہے۔ اس کے بعد عامل کے کہنے پر وہ اپنے آپ کو ایک پندرہ سالہ حیادار دوشیزہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایکا ایکی ہٹلر بن جاتا ہے۔ اور اس کی تمام حرکتیں ہٹلر کی طرح ہوتی ہیں۔ اس نقل کو وہ جس عمدگی کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کی توقع بیداری کی حالت میں نہیں ہو سکتی۔

ان مظاہر سے مشابہ امور جو ہمیں روزانہ پیش آتے ہیں اور جنہیں ہم دیکھتے ہیں۔ نہایت دلچسپ ہیں۔ اگر ہم ایک خاص قسم کی عمدہ چائے پینے کے عادی ہوں۔ کسی موقعہ پر ہمیں معمولی قسم کی چائے عمدہ قسم کا نام دے کر پیش کی جائے۔ تو کیا ہم دھوکہ نہیں کھا جاتے؟ اور اس ادنیٰ چائے کو اعلیٰ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اور ویسا ہی ذائقہ بھی خیال کرتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو یقین ہو کہ سنگترہ یا اس کے مزاج کے موافق نہیں ہے۔ تو اکثر اوقات اس کا نام بدل دینے سے اس کے تمام ناخوشگوار اثرات دور ہو جاتے ہیں۔ اور غذا دینے کا مقصد حل ہو جاتا ہے۔ پیٹنٹ ادویات بڑی کثرت سے فروخت ہوتی ہیں۔ ان میں اکثر ایک پیسہ کی دوا بھی نہیں ہوتی۔ پھر عوام کالانعام ان کی تعریف میں کیوں رطب اللسان ہیں؟ اس لئے کہ انہیں فائدہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص ان ادویہ کے استعمال سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اس کی حالت اس معمول سے مختلف نہیں ہوتی۔ جو حالت تنویم میں پانی کے گلاس کو جام مے سمجھ کر پیتا ہے۔

خواب کی حالت میں اوہام اور مغالطات کی مثالیں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ اس وقت ذہن فرضی مناظر میں سے گزرتا ہے۔ اور بہت سے مفروضہ کام کرتا ہے۔ وہ ان امور میں ایک [illegible] ہو جاتا ہے۔ کہ بعض اوقات ہم خوفناک منظر کو دیکھ کر چیخ اٹھتے ہیں۔ اور کبھی کسی

مضحکہ خیز امر پر قہقہہ بلند کرتے ہیں۔ اور کسی سانحہ پر سچ مچ آنسو بہانے لگتے ہیں۔ رات کے خوابوں کے علاوہ ہم دن کو بیداری کی حالت میں بھی خواب دیکھتے ہیں۔ اور ماضی و مستقبل کے نظاروں میں سے گزرتے ہیں۔ ہم ہوائی قلعے بناتے ہیں۔ اور ایسی باتیں اور لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ جن کا وجود حقیقت میں عنقا ہوتا ہے۔ کبھی تو یہ مناظر ایسی خوبی سے گزر جاتے ہیں کہ ہم ششدر ہو جاتے ہیں۔

معمول گہری تنویمی حالت میں بہت سے عجیب غریب کام کر گزرتا ہے۔ لیکن بیدار ہو کر یاد آ جانے کا قطعاً علم نہیں ہوتا یا صرف مدہم سا نقش ہوتا ہے۔ البتہ دوبارہ تنویم طاری کرنے پر وہ سب باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ خوابوں کا بھی یہی حال ہے۔ بیدار ہو کر یا تو یہ بالکل فراموش ہو جاتے ہیں۔ یا دھندلا سا خیال باقی رہتا ہے۔ نیند میں بعض اشخاص ایسے کام کر جاتے ہیں۔ جو بیداری کی صورت میں ان کے امکان میں نہیں ہوتے۔ پھر جب وہ بیدار ہوتے ہیں تو انہیں اس کا قطعاً علم نہیں ہوتا۔ پگانینی (Paganini) کے متعلق مشہور ہے۔ کہ ایک دن جب وہ علی الصبح بیدار ہوا۔ تو اس کے مشہور گیت کے صفحے کے صفحے لکھے ہوئے تھے۔ جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے۔ اس نے اسے شیطان سے منسوب کر دیا۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ بیداری کی حالت میں جو پیچیدہ مسائل حل نہ ہو سکے۔ وہ نیند کی حالت میں .... خود بخود حل ہو گئے۔ اس بات سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ اور جب کوئی دشوار امر درپیش ہوتا ہے۔ تو یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اسے ذہن میں رکھ کر سو جائیں تاکہ صبح اس کا کوئی حل سمجھ میں آ جائے۔

اگرچہ علاج کے لئے تنویم کے عمیق درجے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ لیکن اکثر ماہرین پہلا درجہ ہی طاری کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ ہے۔ کہ ہر شخص پر گہری تنویمی حالت طاری نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہلکا تنویمی اثر قریباً ہر شخص پر ڈالا جا سکتا ہے۔ اس حالت میں بھی نمایاں فائدہ ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے ضعیف اثرات کی بنا پر بالعموم معمول تنویمی اثر سے انکار کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ آنکھیں کھولنے پر قادر ہوتے ہیں۔ اور عامل کی توجہات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یعنی ممکن ہے۔ کہ وہ عامل کے حکم پر عمل کریں یا اسے رد کر دیں۔ اس اثنا میں باتیں ہوتی ہیں۔ وہ بھی انہیں یاد رہتی ہیں۔ ان سب امور کے باوجود وہ تسلیم کرتے ہیں۔ کہ اس حالت میں وہ سکون اور آرام وہ اثر محسوس کرتے ہیں۔ طبعی آرام کی حالت اور تنویمی اثر میں جو فرق ہے۔ ان میں دو باتیں بالخصوص اہم ہیں۔ اول یہ کہ معمول اس حالت میں بالکل ساکت پڑا رہتا ہے۔ اور اعضا کو حرکت دینے یا پہلو بدلنے کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ دوم یہ کہ اس وقت وہ ان احکام کو تسلیم کر کے ان پر عمل کرتا ہے۔ جنہیں وہ بیداری کی صورت میں قبول نہیں کرتا تھا۔

توجہ مابعد

حالت تنویم میں مریض سے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ بیدار ہو کر ایک معینہ عرصہ کے بعد ایک اشارے پر یا بغیر کسی اشارے کے وہ کام یا حرکت کر دیگا۔ جس کیلئے اُس سے کہا جا رہا ہے۔ عام طور پر معمول یہ حرکت بالکل طبعی طریقے پر کرتا ہے۔ اور جو احکام اُسے دیئے جائیں۔ انہیں کامل صحت کے ساتھ پورا کرنے کے باوجود اگر وہ حالت تنویم کے واقعات کو فراموش کر چکا ہو۔ تو اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ اُس سے یہ فعل کیوں سرزد ہوا! اگر اس سے دریافت کیا جائے۔ تو وہ اس کی کوئی وجہ بیان کر دیتا ہے۔ یا یہ کہہ دیتا ہے۔ "میں نے اسے اپنی مرضی سے کیا تھا۔" ڈاکٹر ملنے برموبل نے ایک عورت کو (جس کی تعلیم واجبی سی تھی) حالت تنویم میں یہ توجہ مابعد .... (Hypnotic Suggestion) دی کہ اتنے ہزار منٹ کے بعد "تم اس کاغذ پر اپنا نام، وقت اور تاریخ لکھ دو گی"۔ بیدار ہو کر وقت مقررہ پر اس نے ایسا کر دیا۔ حالانکہ ذہنی طور پر وہ وقت کا اندازہ کرنے سے قاصر تھی۔ ماہر بریڈیل نے اس طرح کے دلچسپ تجربے بکثرت کئے ہیں۔ مثلاً بعض معمولوں کو توجہ مابعد دی۔ کہ "وہ یہ پیغام، اس وقت، اس جگہ" پہنچائیں۔ اگرچہ اس حکم کی تعمیل کے سلسلہ میں بہت سی مشکلات پیدا کی گئیں۔ لیکن انہوں نے عین وقت پر اس کی تعمیل کر ہی دی۔

ماہر ہجینسن نے توجہ مابعد کی تشریح لاشعور اور شعور کے ذریعے کی ہے۔ جب شعور سویا ہوا ہوتا ہے۔ اُس وقت لاشعور ان پیغامات کو وصول کرتا ہے۔ اور وقت معینہ پر شعور سے ان کی تعمیل کراتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم سوتے وقت اپنے دل میں اس بات کا تہیہ کر لیں۔ کہ فلاں وقت جاگ اٹھیں گے۔ تو عین وقت پر ہماری آنکھ کھل جاتی ہے۔ ایک اور مثال سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ ہم کسی شخص سے کسی کام کا وعدہ کرتے ہیں۔ لیکن بعد ازاں وہ فراموش ہو جاتا ہے۔ اور ہم دوسرے امور میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ چند روز

بعد بغیر کسی نا اس وجہ کے وہ وعدہ ہمیں بعینہٖ اس طرح یاد آتا ہے۔ جیسے توجہ مابعد دی گئی ہو۔

عملی طور پر توجہ مابعد کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے علاج بالتنویم میں بڑی مدد ملتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کو بے خوابی کا عارضہ لاحق ہے۔ اُسے توجہ مابعد دی جاتی ہے۔ کہ "تم اس وقت اونگھنے لگو گے۔ اور اتنے گھنٹے سوؤ گے"۔ کبھی تو اس حکم کی پوری تعمیل ہوتی ہے۔ اور کبھی بتدریج افاقہ ہوتا ہے۔ اسی طرح مزمن قبض کے مریض کو مفید مطلب ہدایات دی جا سکتی ہیں۔ اور چند بار کے عمل سے مریض کو شفا حاصل ہو جاتی ہے۔ نقصان الشہوت (بھوک کی کمی Loss of appetite) یا اس وقت جب مخصوص غذا ہضم نہ ہوتی ہو۔ اس کے ذریعے ہضم کو قوی کیا جا سکتا ہے۔ کسی شخص کو نئے خیالات اور نئے مقاصد زندگی سمجھا کر اس کے کردار میں نہایت اہم ترمیم کی جا سکتی ہے۔ توجہ مابعد بتدریج اس کے خیالات پر اثر انداز ہو کر اس کی زندگی میں ترمیم یا تبدیلی کر سکتی ہے۔

تنویمی نیند کے آخری درجہ میں توجہات زیادہ تر مؤثر ہوتی ہیں۔ اور یہی درجہ توجہ مابعد کا ہے۔ ایقان سے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ یہ توجہات کتنی مدت تک مؤثر رہتی ہیں۔ غالباً وقت کے ساتھ ان کے اثر میں بھی کمی ہو جاتی ہے۔ پھر بھی یہ اثر دنوں، ہفتوں بلکہ مہینوں تک رہ سکتا ہے۔ حتٰی کہ بعض مثالوں میں توجہ مابعد پر ایک سال کے بعد عمل کیا گیا۔

توجہ مابعد کے نتیجہ میں جو فعل سرزد ہوتا ہے۔ معمول خود اس کے محرک سے ناواقف ہوتا ہے۔ اس لئے وہ صحیح قسم کی دلیل پیش کرتا ہے۔ مثلاً اگر اس قسم کی توجہ دی جائے کہ "جب میں تیسری دفعہ گھنٹی بجاؤں گا۔ یا ساتویں دفعہ اپنے سر پر ہاتھ پھیروں گا۔ تو اپنا کوٹ اتار کر زمین پر پھینک دو گے"۔ معمول کو بیدار کرنے کے بعد عامل اس سے باتیں کرتا ہے۔ اور اس اثنا میں اپنے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے یا وقتاً فوقتاً گھنٹی بجاتا ہے۔ جب عامل تیسری دفعہ گھنٹی بجائے گا یا ساتویں مرتبہ اپنے سر پر ہاتھ پھیرے گا۔ تو معمول فوراً اپنا کوٹ اتار کر زمین پر پھینک دے گا۔ اب اگر معمول سے اس کی وجہ دریافت کی جائے۔ تو وہ اسی قسم کی دلیل اختراع کرے گا کہ "مجھے گرمی محسوس ہو رہی تھی"۔ حالانکہ حقیقت میں کوئی گرمی نہیں تھی۔ اس سے یہ پوچھا جائے کہ تم نے کوٹ زمین پر پھینکنے کی بجائے اسے سامنے کھونٹی پر کیوں نہیں لٹکایا؟ تو فوراً جواب دے گا "میں نے اسے نہیں دیکھا"۔

ماہر ماہیم میکڈوگل کی رائے میں توجہ مابعد کا فعل اہم یادگار ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسے ہی چھوڑ دیا جائے۔ اور کچھ دیر کے بعد معمول سے دریافت کیا جائے۔ تو وہ اس کو یادداشت سے انکار کر دیتا ہے۔ میکڈوگل اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ اگر معمول پر نظر رکھی جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ وہ عامل کے فعل (اپنی ناک پر انگلی) کو کنکھیوں سے دیکھتا جا رہا ہے۔ تاہم اگر اس سے اس فعل سے قبل یا بعد پوچھا جائے کہ وہ اس قسم کی توجہ سے واقف ہے، تو وہ شدت سے انکار کرتا ہے۔ لیکن ہم اسے جھوٹا قرار نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اس کا جو حصہ عامل کے سوال کا جواب دیتا ہے (اسے تفہیم کیلئے معمول اول کہہ سکتے ہیں) وہ یہ کہہ کر جھوٹ نہیں بولتا۔ کہ "میں اس قسم کی کسی ہدایت کو نہیں جانتا"۔ عامل کے اشاروں کا جو حصہ مشاہدہ کرتا، انہیں گنتا اور پھر عمل کرتا ہے وہ کلی طور پر مختلف ہوتا ہے۔ ماہر میکڈوگل نے انقسام شخصیت کے حقیقی اقتباسات کے ذیل میں ایک نہایت دلچسپ مثال دی ہے۔ اس میں معمول ایک ایسا ماہر نفسیات تھا۔ جو نظریہ تنویم سے بھی شغف رکھتا تھا۔ اسے یہ توجہ دی گئی۔ کہ "وہ ایک مخصوص اشارے پر اپنی کرسی سے اٹھ کر دوسری پر جا بیٹھے گا"۔ تنویمی اثر کے بعد اس نے اس ہدایت سے ناواقفیت کا اظہار کیا۔ جب اشارہ کیا گیا۔ تو وہ مضبوطی سے اپنی کرسی پر جم گیا۔ دوسری کرسی کی طرف بے چینی سے دیکھنے کے باوجود اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے۔ تم نے مجھے اٹھ کر دوسری کرسی پر بیٹھنے کو کہا تھا۔ لیکن میں اپنی کرسی ہرگز نہ چھوڑوں گا"۔ اور وہ اپنی کرسی پر ڈٹا رہا ہے۔ اس کی بے چینی بڑھتی گئی۔ لیکن اس نے اپنی جگہ بیٹھے رہنے کے مصمم ارادہ کا اظہار کیا۔ لیکن تابہ کے؟ آخر کار اس نے کہا۔ "گولی بھی مارو۔ میں اٹھ ہی کیوں نہ جاؤں"۔ اور یہ کہتے ہی اپنی کرسی چھوڑ کر دوسری کرسی پر جا بیٹھا۔

جب معمول کو کسی بیہودہ کام کے کرنے کی ہدایت دی جائے (مثلاً یہ کہ وہ کرسی کو میز پر رکھ دیگا) تو اشارہ کرنے کے بعد یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور بعد میں معمول کے بیان سے اس پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔ کہ معمول میں اس کام کے کرنے کیلئے سخت ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے لغو ہونے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ اسے دبانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن اکثر اوقات وہ گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد واپس آکر کہتا ہے کہ "میرے خیال میں تم نے مجھ سے یہ کام کرنے کیلئے کہا تھا۔ جب تک میں یہ کام نہ کروں گا۔ مجھے چین نہ آئیگا"۔ اس کے بعد وہ یہ کام کر دیتا ہے۔ خواہ میز پر کرسی رکھنے کی ہو یا سر کے بل کھڑے ہونے کا۔ اور مطمئن

ہو کر چلا جاتا ہے۔ اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ معمول کو ایسی حالت میں نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ جب کہ ایسی توجہ پوری نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ اس میں باطنی متنازع رہ جاتا ہے۔ جو تکلیف دہ اور ضرر رساں ہو سکتا ہے۔

بسا اوقات توجہ ما بعد کے اثر بھی رہتی ہے۔ اس قسم کی ایک مثال ڈاکٹر امیتو نے دی ہے۔ ان کے پاس ایک ایسی مریضہ لائی گئی۔ جسے اپنی منشا کے خلاف کام کرنے کی صورت میں شدید جھینگا پن ہو جاتا تھا۔ ایک دو بار تنویم کر کے وہ اس تکلیف کو دور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اسے ایک دفعہ یہ ہدایت دی کہ جب گھڑی بارہ بجائے گی۔ تو وہ اپنے کام کاج چھوڑ کر پانی پینے کے لئے اٹھ بیٹھے گی۔ جس وقت گھڑی نے بارہ بجائے وہ اپنے کام میں بیحد مصروف تھی۔ اس نے کہا "میں شدید تشنگی محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن چونکہ کام میں زیادہ مصروف ہوں۔ اس لئے کچھ دیر بعد پانی پی لونگی"۔

تنویم اور جُرم

اس امر میں ماہرین تنویم کے درمیان اختلاف ہے۔ کہ تنویمی توجہ سے کسی شخص سے جُرم کا ارتکاب کرایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اکثر معروف ماہرین کا رجحان اس طرف ہے۔ کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ لیکن بعض ماہرین مثلاً ڈلبوف (Delboeuf) لیڈ وس (Liegeois) اور کینن (Cannon) نے اس کی تردید کی ہے۔ ان کے خیال میں ارتکاب جُرم کی ترغیب دی جا سکتی ہے۔ لیڈ وس نے اپنی رائے کی ایک مثال سے وضاحت کی ہے۔ جس میں تنویمی توجہ کی متابعت میں ایک معمول نے کاغذ کا چاقو اپنی بیوی کے سینے میں گھونپ دیا تھا۔ شارکوٹ اور اس کے متبعین نے اس رائے کی تردید کی ہے۔ ان کے خیال میں معمول جب اس تمام نہاد جُرم کا ارتکاب کر رہا تھا۔ تو وہ اس کی بے ضرر نوعیت سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ یہ اداکاری ہے۔ اس لئے اس نے اپنا کردار خوب نبھایا۔ یہی بات دوسرے تجربی جرائم کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ مثلاً ... کی چوری، کسی شخص کے کھانے میں وہ چیز ڈلوانا جس کے متعلق بتا دیا گیا ہو۔ کہ یہ زہر ہے۔ کسی شخص کو ایسے پستول کا نشانہ بنوانا۔ جس میں خالی کارتوس ہوں۔ اور معمول اصلیت سے واقف تھا۔ اگر انہیں حقیقت کا جامہ پہنایا جاتا۔ تو یہ امر ناممکن ... ہوتے۔ پروفیسر ... نے تحریر کیا ہے۔ کہ ایک شریف نوجوان لڑکی ایک مشہور ماہر تنویم کی معمول تھی۔ وہ اس کے ہاتھ میں کاغذ کی تلوار دے کر ... سخت ظلم کروا سکتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے طالبعلموں اور استادوں کی موجودگی میں اس پر عمل کیا۔ کچھ دیر بعد عامل نے طالب علموں سے کہا۔ کہ وہ ... سر سیام لے سکتے ہیں۔ وہ خود اور استاد باہر نکل آئے۔ طالب علموں نے لڑکی سے کہا۔ کہ وہ تمام کپڑے اتار دے۔ یہ سن کر وہ لڑکی فوراً بیدار ہو گئی۔ اور سخت طیش کی حالت میں گھر چلی گئی۔

ان دو آراء کے درمیان جو اختلاف ہے۔ وہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ بعض اہم امور کو نظرانداز نہ کیا جائے۔ اولاً یہ کہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ جو کلیتہً عامل کے بس میں آ جاتے ہیں۔ اکثریت کا یہ حال ہے۔ کہ اگر انہیں جرم کی ترغیب دی جائے۔ تو ان کا شعور فوراً بیدار ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ گہری حالت تنویم میں بعض اوقات عورتوں کی عصمت خراب کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ حالت ویسی ہے۔ جیسے کسی مریضہ کو کلوروفارم یا کوئی اور دوا دے دی جائے۔ لیکن اصل مبحث یہ نہیں ہے۔ کہ تنویمی بیہوشی میں کسی عورت پر مجرمانہ حملہ کیا جا سکتا ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ تنویم سے کسی جرم کا ارتکاب کروایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ماہرین ... کی رائے ہے۔ کہ بعض حالات میں تنویم سے جُرم کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ اگرچہ کسی بلند اخلاق شخص کو جرم کی ترغیب دینا بے سُود ہے۔ کیونکہ یا تو وہ فوراً بیدار ہو جائیگا یا تنویمی توجہ کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ لیکن کمزور اور ادنیٰ اخلاق کے لوگوں کو بہ آسانی اس کی ترغیب دی جا سکتی ہے۔ اگر ایک پرہیزگار انسان کو یہ تنویمی توجہ دی جائے۔ کہ وہ بیدار ہو کر شراب پئے گا۔ تو یہ یقینی امر ہے۔ کہ توجہ ناکام رہے گا۔ خواہ تنویم کا کوئی سا درجہ ہی ہو۔ لیکن ایک کمزور سیرت شخص جو دراصل شراب کو برا نہیں سمجھتا۔ بلکہ لوگوں کے ڈر سے محترز ہے۔ ممکن ہے۔ اسے پی لے۔ اس نظریہ کی بنا پروفیسر لومبروسو (Lombroso) کے بعض تجربات پر ہے۔ انہوں نے دو بد اخلاق نوجوان طلبہ کے طالبعلموں پر تنویم طاری کر کے یہ ترغیب دی۔ بعض چیزیں چرا لیں۔ ان میں سے ایک یہ چلاتے ہوئے بیدار ہو گیا۔ "کہ میں چور نہیں ہوں گا"۔ دوسرے نے بڑی ... اشیا اٹھائیں۔ لیکن فوراً ہی پھینک دیں۔

اس کے برعکس جب انہوں نے ... کی ایک اتفاقی مریضہ پر تنویم طاری کر کے کہا۔ کہ وہ "چور ہے"۔ تو اس نے فوراً تسلیم

کرلیا۔ اور اس سلسلہ میں کوئی پس و پیش نہ کی۔ ماہر مکی اپنے تجربات کی بنا پر اس رائے کا حامل ہے۔ کہ ہم میں خیر کی طاقت شر سے کہیں قوی ہے۔ اور کسی بدکردار شخص کو نیک کام کیلئے آمادہ کرنے کی نسبت کسی نیک انسان کو بُرے کام کے لئے ترغیب دینا کہیں دشوار ہے۔

ماہر کینگی کی رائے میں بھی بعض لوگ حالت تنویم میں جرائم کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔ انہوں نے قتل کے ایک مشہور مقدمہ کے سلسلے میں اسے عملاً ثابت کیا تھا۔

ماہر میگنڈوگل نے تحریر کیا ہے۔ کہ کسی طبعی شخص کو تو تنویم سے جرم کی طرف مائل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جو شخص بالطبع اس کی طرف مائل ہو۔ اس کی نسبت دعوے نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اسے تنویم سے جرائم کی ترغیب نہیں دی جا سکتی۔ انہوں نے ان مظاہر کی توجیہہ اس طرح کی ہے۔ کہ ان میں شخصیت کا ایک حصہ تو لغو توجہات کو تسلیم کر کے ان پر عمل کرتا ہے۔ لیکن دوسرا حصہ خاموش تماشائی بن کر سارا تماشا دیکھتا رہتا ہے۔ گویا اسے معلوم ہے کہ یہ سب کھیل ہے۔ چنانچہ اگر یہ کھیل معمول کی اخلاقی حدود سے تجاوز کرتے تو یہ حصہ فوراً بروئے کار آکر حالت تنویم کو ختم کر دیتا ہے۔ اور معمول کی شخصیت کا تشتت مفقود ہو جاتا ہے۔

فریب نظر

فریب نظر (Negative Hallucination [illegible]) کا مظہر تنویم کے عمیق درجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سے شخصیت کے تشتت کی شہادت ملتی ہے۔ تنویم کے مظاہر میں یہ شاید سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ بیاٹ کے معمولوں میں قابل ذکر ایک نوجوان عورت کمیل تھی۔ جو بڑی جلدی عمیق درجہ میں پہنچ جاتی تھی۔ اُسے کہا جاتا کہ "بیدار ہو کر وہ مسٹر ...... کو نہیں دیکھے گی نہ اس کی بات سنے گی۔ اور اگر وہ اسے چھوئے گا تو محسوس نہیں کرے گی"۔ اب وہ ایسی حرکات کرتی۔ جس سے معلوم ہوتا کہ اسے اس مخصوص شخص کا ادراک نہیں ہے۔ اس شخص کی باتوں کو وہ نہ سنتی۔ اس کے لمس کو محسوس کرتی۔ کمیل کو اگر یہ کہا جاتا۔ کہ بیدار ہو کر وہ دروازہ نہ دیکھے گی۔ تو اسے دروازہ نظر نہ آتا تھا۔ فی الحقیقت اس حالت میں معمول سے دریافت کیا جائے کہ وہ مخصوص شخص یا چیز کو دیکھ رہا ہے۔ تو وہ شدت سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے۔ کہ وہ اس کا ادراک نہیں کر رہا۔ لیکن اگر اُسے بنظر غائر دیکھا جائے۔ تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی لحاظ سے اس کا ادراک ضرور کرتا ہے۔ مثلاً وہ اس کی طرف نظر نہیں کرتا۔ اور چلتے وقت اس سے ہٹ کر چلتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس وقت معمول کی شخصیت منقسم ہوتی ہے۔ ایک حصہ کیلئے وہ غیر مرئی ہے۔ لیکن دوسرا اسے دیکھتا ہے۔

ڈاکٹر مکی کی رائے میں فریب نظر کے معمول، اعتناقی مزاج کے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک دلچسپ تجربہ کو یوں بیان کیا ہے۔ "اس تجربہ میں معمول ایک تیس سالہ، شادی شدہ، ذہین عورت تھی۔ تجربہ کے وقت اس عورت کا خاوند اس سے چند فٹ کے فاصلے پر ایک کرسی پر بیٹھا آگ سینک رہا تھا۔ میں نے اس پر تنویم طاری کی اور کہا کہ جب وہ بیدار ہوگی۔ تو اُسے اپنا خاوند نظر نہ آئے گا۔ اگر وہ بولے گا۔ تو اُسے سنائی نہ دیگا۔ اگر وہ اسے چھوئے گا۔ تو بھی اُسے محسوس نہ ہوگا۔ بیدار ہونے پر جب میں نے دریافت کیا۔ کہ تمہارا خاوند کہاں ہے! تو اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ لیکن کہا کہ میری رائے میں وہ بالائی منزل پر گیا ہے۔ اور جلد نیچے آجائیگا۔ اس کے خاوند نے اس کا نام لے کر بلایا۔ آگ تیز کرنے کو کہا۔ دریافت کیا۔ کہ اس کی دنیا کہاں ہے۔ ناشتہ کدھر ہے؟ اور اس قسم کے متعدد سوالات کئے لیکن اس نے انہیں مطلقاً نہ سُنا۔ اور متواتر گفتگو کرتی رہی۔ تب اس کا خاوند اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی بیوی کے ہاتھ کو چھوا۔ اور باتیں بھی کیں۔ لیکن اس نے اپنے خاوند کے ادراک کی کوئی علامت ظاہر نہ کی۔ میں نے اس کے خاوند سے کہا۔ کہ وہ اس سے غیر شخصی طور پر بات کرے۔ چنانچہ اس نے اس کا نام لے کر کہا۔ کہ "مسز ...... اب میز کے پاس جائے گی۔ اور ڈاکٹر کے دستانوں کو اٹھا کر پہن لے گی۔ اس نے اسے نہ سُنا۔ لیکن چند منٹ ہی گزرے تھے۔ کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور میز کے قریب جا کر اس نے میرے دستانے پہن لئے۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔ کہ اس نے یہ کام کیوں کیا ہے؟ اس نے کہا۔ "مجھے علم نہیں۔ جی چاہا کہ یہ ضرور کروں۔ بس یونہی۔ وہ اس امر سے بے خبر تھی۔ کہ یہ فعل اس نے اپنے لئے نہیں۔ بلکہ دوسرے کے منشاء سے کیا ہے۔ جب میں نے اس کی آنکھوں پر پھونک ماری اور کہا۔ "مسز ...... تمہارا خاوند تمہارے قریب بیٹھا ہوا ہے۔ اب تم اسے دیکھ سکتی ہے۔ تو اس [illegible] اپنے خاوند کی طرف دیکھا اور [illegible] ہوں۔ لیکن ایک منٹ قبل یہ کہاں تھے؟ پھر اس نے کہا۔ کہ وہ دیتا ہیں یہ دھندلے سے دکھائی [illegible] عام مثال ان لوگوں میں ملتی ہے۔ جو [illegible]

خیالات میں بے حد مستغرق ہوتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ بسا اوقات ان کی نظر بھی ان پر پڑتی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ انہیں پہچانتے نہیں۔ بعد میں وہ اس امر کی تردید کرتے ہیں کہ انہوں نے کسی کو دیکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔

فریب مابعد (Post Hypnotic Hallucinations) اگر ایک شخص پر تنویم طاری کر کے اسے یقین دلایا جائے۔ کہ اس کا روپیہ گم ہو گیا ہے یا اس نے کوئی اہم واردات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور بیداری کے بعد اس سے دریافت کیا جائے۔ تو وہ ان کی تفصیلات کو پورے اعتماد کے ساتھ بیان کرے گا۔ یہاں تک کہ اگر ضرورت ہو۔ تو وہ عدالت میں بھی شہادت دے سکتا ہے۔ انہیں اس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔ کہ معمول پر دوبارہ تنویم طاری کر کے اس کے ذہن سے یہ خیالات دور کئے جائیں۔

عضوی اثرات

عضوی اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں۔ جو ہمارے شعور کے تصرف میں نہیں ہیں۔ مثلاً دوران خون وغیرہ۔ یہ اشتراکی نظام عصبی کے ضبط میں ہیں۔ جن کا سمجھنا بجائے خود نہایت عسیر الفہم ہے۔ تنویمی توجہ کے عضوی اثرات نہایت عجیب و غریب ہیں۔ حالت تنویم میں اگر معمول سے کہا جائے۔ کہ اس کے جسم کا فلاں حصہ کسی قدر جل گیا ہے۔ تو جلد سرخ ہو جاتی ہے۔ اور اس جگہ حرارت بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر اس سے کہا جائے کہ اس کے بدن کے اس حصہ پر چوٹ آئی ہے۔ تو وہ زرد ہونے لگتی ہے۔ ماہر ہیڈ فیلڈ نے اس طرح ایک معمول کی جلد پر آبلے پیدا کئے تھے۔ ماہرین ہیپنگ اور حوف نے ایک معمول سے کہا۔ کہ وہ لذیذ کھانا کھا رہا ہے۔ لاشعوری سے دیکھا گیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ اس کے معدے کے افعال میں فرق پڑ گیا ہے۔

ڈاکٹر [illegible] نے اپنے تجربہ کا حال ان الفاظ میں لکھا ہے۔ "اس معمول نے مجھے تجربات کرنے کی اس شرط کے ساتھ اجازت دی تھی۔ کہ وہ زیادہ تکلیف دہ یا [illegible] نہ ہوں۔ لیکن اسے تجربات کی نوعیت کا قطعاً علم نہ تھا۔ میں نے اس پر تنویم طاری کی۔ اور اس کی کلائی کے مخصوص حصے کو [illegible] پنسل سے چھو کر کہا۔ [illegible] کی کلائی اس جگہ سے جل گئی ہے۔ غالباً ابلتا ہوا پانی اس جگہ گرا ہے۔ [illegible] جگہ کی سرخی [illegible] ذرا سی [illegible] پندرہ منٹ کے بعد میں نے اسے بیدار کیا تب اس نے اٹھتے ہی کلائی اس طرح تھام لی۔ گویا درد ہو رہا ہے [illegible] پوچھنے پر کہ کیا بات ہے؟ اس نے جواب دیا۔ میرا خیال ہے۔ مجھ سے ضرور میری کلائی پر ابلتا ہوا پانی گر چکا ہے [illegible] کلائی دیکھنے سے وہ جگہ جس کا قطر ایک روپیہ جتنا تھا۔ نہایت سرخ نظر آ رہی تھی۔ [illegible] سوزش [illegible] درد کا کوئی احتمال نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اس پر دوبارہ تنویم طاری کی اور کہا کہ جب وہ بیدار ہو گی۔ تو درد اور سرخی کا قطعاً نشان [illegible] ہو چکی ہو گی۔ فی الحقیقت ایک قلیل عرصہ میں درد کی علامت دور ہو گئی۔ اور جب وہ بیدار ہوئی۔ تو اسے کوئی تکلیف نہ تھی۔ اس نے دل سے پہلے تجربہ کے بعد طبیعت کے خراب ہونے کی شکایت کی تھی۔ اس پر میں نے اسے آئندہ کے لیے توجہ دی۔ کہ وہ بیدار ہو کر یہ شکایات محسوس نہ کرے گی۔"

رابطہ

رابطہ (Rapport) سے مراد یہ ہے۔ کہ معمول صرف عامل کی توجہات کو سنے اور ان پر عمل کرے اور دوسروں سے اس کا تعلق قریباً ختم ہو جائے۔ اس حالت میں معمول عموماً عامل کے لئے بہت حساس ہو جاتا ہے۔ اور وہ عامل کے ہر ہلکے سے ہلکے اشارہ پر عمل کرتا ہے۔ لیکن دوسروں کی طرف وہ اعتنا ہی نہیں کرتا۔ اور نہ ان کی توجہات اس پر اثر کرتی ہیں۔ بعد میں پوچھنے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ ان کی باتوں کو سن کر مجبور رہا تھا۔ اگر معمول سے کہا جائے۔ کہ وہ کرسی سے نہیں اٹھ سکتا۔ پھر اسے تحدی کیا جائے کہ وہ اٹھنے کی کوشش کرے۔ تو وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ لیکن کامیاب نہیں ہوتا۔ کیونکہ مخالف العمل عضلات اس زور سے سکڑتے ہیں۔ کہ وہ اٹھنے سے مجبور ہو جاتا ہے۔ اب خواہ کتنے ہی آدمی [illegible] اسے یقین دلائیں [illegible] وہ اٹھ نہیں سکتا۔ لیکن اگر عامل کسی شخص کے متعلق معمول سے کہے۔ کہ یہ بھی تمہارے عضلات پر مجھ جتنا اختیار رکھتا ہے۔ تو اس کے کہنے پر بھی معمول کے عضلات ڈھیلے ہو جائیں گے۔ اور وہ فوراً کرسی سے اٹھ کھڑا ہو گا۔

اس مظہر کو جس میں عامل اور معمول کا رابطہ چند الفاظ سے ایک اور شخص تک وسیع ہو جاتا ہے۔ انتقالِ رابطہ (Transference of Rapport) سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مکڈوگل نے اس امر کی وضاحت کی ہے۔ کہ رابطہ میں معمول صرف عامل کے حکم کی تعمیل پر ہی مجبور نہیں ہوتا۔ اس نے ایک عمدہ مثال دی ہے۔ جس میں معمول ایک سپاہی تھا۔ مکڈوگل کے ایک نائب نے اس پر تنویم طاری کی۔ اور میز پر سگریٹ رکھ کر کہا۔ کہ وہ اسے نہیں اٹھا سکتا۔ پھر تحریک دی۔ کہ وہ اسے اٹھانے کی کوشش کرے۔ معمول نے کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ ماہر میکڈوگل نے اس پر کبھی تنویم طاری نہیں کی تھی۔ اور نہ اس کے رفیق نے انتقالِ رابطہ کیا تھا۔ اس کے باوجود جب اس نے معمول سے کہا۔ کہ وہ سگریٹ اٹھا سکتا ہے۔ تو اگرچہ ابتداً وہ کچھ پس و پیش سے کام لیتا رہا۔ لیکن توجہات کے اعادہ پر کچھ کشمکش کے بعد وہ سگریٹ اٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس واقعہ میں مکڈوگل کی کامیابی کا اصل سبب یہ تھا۔ کہ سپاہی کی تمام عمر افسروں کی اطاعت میں گزری تھی اور چونکہ مکڈوگل بھی افسر تھا۔ اس لئے سپاہی اس کی توجہات کو قبول کرنے کی طرف بالخصوص مائل ہو گیا تھا۔ مکڈوگل کی رائے ہے۔ کہ وہ خود اگر سپاہی کے رتبہ کا ہم رتبہ یا اس سے کمتر ہوتا۔ تو اس کی توجہات معمول پر اثر انداز نہ ہوتیں۔

ماہر لیبالٹ اور پروفیسر برنہیم ایک اشتراکی مریضہ پر تنویم طاری کیا کرتے تھے۔ ان دونوں میں سے خواہ کوئی بھی تنویم کرتا۔ وہ نہایت آسانی سے عمیق ترین نیند میں پہنچ جاتی۔ ایک دفعہ برنہیم نے اس پر تنویم طاری کر کے یہ کہا۔ کہ آئندہ وہ لیبالٹ سے اثر پذیر نہیں ہوا کرے گی۔ یہ بات وہ بیدار ہو کر بھول گئی۔ اور اسے اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ کچھ دیر بعد وہ لیبالٹ کے پاس گئی۔ جو خود بھی اس سے ناواقف تھا۔ کہ برنہیم نے کیا توجہ دی ہے۔ اس نے مریضہ پر تنویم طاری کرنے کی بہتیری کوشش کی۔ لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ یہ صورت معمول ہی لیبالٹ اور مریضہ دونوں کے لئے یکساں استعجاب کا باعث تھی۔ بالآخر برنہیم کے بتانے پر انہیں اصل بات کا پتہ چلا۔

ماہرین وڈ اور تگی نے ایک تجربہ کیا تھا۔ جس کا حال آخر الذکر نے بیان کیا ہے۔ "میں نے کئی ہفتوں سے مسز ...... پر تنویم طاری نہیں کی تھی۔ اور ہم سیشنوں میں مزید توجہات … کسی دوسرے سے اثر پذیر نہ ہو۔ میں نے اسے کہا۔ کہ ڈاکٹر وڈ تم پر تنویم طاری کرنا چاہتے ہیں … اس کے بعد میں باہر چلا گیا۔ جب میں نصف گھنٹہ کے بعد واپس آیا۔ تو معمولہ بیدار ہو چکی تھی۔ اور ڈاکٹر وڈ نے بتایا کہ وہ بیس منٹ تک اس کی نظر … کے تنویم طاری کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کے بعد وہ باہر نکل گئے۔ میں نے دیکھا کہ معمولہ میرے سوالوں کا جواب نہیں دیتی۔ ڈاکٹر وڈ کے ساتھ اس کا رابطہ ہو چکا ہے۔ … میں نے بیداری کی ترکیب استعمال کی۔ اور بلند آواز میں ایک مریض سے مخاطب ہو کر کہا۔ کہ اب مسز ...... آرام دہ نیند میں ہے۔ لیکن وہ چند سیکنڈ … کے بعد بیدار ہو گئی۔"

علاوہ ازیں تجربہ کا اعادہ چند ماہ کے بعد کیا گیا … سے قبل میں نے اس پر متواتر تین دفعہ تنویم طاری کی۔ اور یہ توجہ دی۔ کہ وہ قطعاً کسی دوسرے شخص سے اثر پذیر نہ ہو۔ اس کے متعلق … بیدار ہوئی۔ تو یہ بات فراموش کر چکی تھی۔ میں نے اس سے یہ کہا۔ کہ ڈاکٹر وڈ تم پر تنویم طاری کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس نے انکار کیا۔ لیکن میرے اصرار پر مان گئی۔ میں نے واپس آ کر یہ دیکھا۔ کہ معمولہ پر تنویم طاری نہیں ہو سکی۔ حالانکہ بیس منٹ تک کوشش کی گئی تھی۔ اس کی طبیعت بے حد خراب تھی۔ رنگ اڑ گیا تھا۔ میں نے اس پر فوراً تنویم طاری کی۔ اور اس کی شکایات رفع ہو گئیں۔ بیداری پر اس نے کہا کہ "مجھے اس قدر تکلیف ہوئی ہے۔ کہ آئندہ میں کسی شخص کو اپنے پر تنویم کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔"

توجہ

اگر کسی تندرست شخص سے کہا جائے کہ "تم بیمار ہو" اور ہمارے انداز گفتگو میں اس قدر یقین ہو کہ اس پر اثر کر جائے۔ تو وہ مرض کا خیال کریگا اور کچھ عرصہ کے بعد آہستہ آہستہ اس کا احساس ہونے لگیگا۔ اس کے برعکس اگر مریض کو یقین دلایا جائے کہ اس کے چہرہ سے تندرستی کی رونق برس رہی ہے۔ تو وہ اسے محسوس کریگا۔ اور صحت یاب ہونے لگیگا۔ اگر مخاطب طبیب ہو۔ تو یہ اثر یقیناً زیادہ ہوگا۔ فی الحقیقت جو خیالات ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان سے ہمارا جسم اور دماغ متاثر ہوتا ہے۔ جب مریض پر تنویمی حالت طاری کر کے یہ توجہ دی جاتی ہے۔ کہ تم تندرست ہو۔ تو وہ بیدار ہو کر اپنی صحت کا خیال کرتا ہے۔ اور اس ایقان کا نتیجہ اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ توجہ تنویم کی اساس ہے۔ اور تنویم کے بغیر بھی اتنی ہی کامیاب ثابت ہوتی ہے۔

توجہ کی تعریف۔ مختلف ماہرین نے توجہ (Suggestion) کے مختلف نظریے پیش کئے ہیں۔ ڈبلیو، ایچ مائیرز نے اسے "تحت شعوری ذات کی طرف کامیاب مراجعت" سے تعبیر کیا ہے۔ ہالینڈر نے یہ مراد لی ہے کہ "اس عمل میں کسی خیال کو بلا اعتراض تحت شعور میں داخل کر لیا جاتا ہے۔ یہ خیال اس صورت میں جاگزیں ہوتا ہے۔ کہ شعوری طور پر نہ اس کے قبول کرنے کا میلان ہوتا ہے۔ اور نہ منطقی طور پر کوئی وجہ ہوتی ہے۔" بالڈون نے اس کی یہ تشریح کی ہے۔ کہ "یہ وہ عمل ہے۔ جس سے ایک خیال اپنے آپ کو فعل کی صورت میں تحقق کرنے یا متحقق کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔" برنہیم کی تعریف ہے کہ "خیالات کو پیدا یا قبول کرنے کی ذہنی قابلیت اور ان کے متحقق کرنے اور افعال میں بدلنے کا اس کا میلان ہے۔" ولیم میکڈوگل نے بیان کیا ہے کہ "توجہ میں ایک حکم کی اطلاع دہی اس طریقہ سے ہوتی ہے کہ سننے والا اس کو پورے یقین کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ حالانکہ اس ایقان کے لئے اس کے پاس کوئی منطقی بنا نہیں ہوتا۔"

لاشعور سے تعلق۔ ان تمام تعریفوں سے واضح ہوتا ہے۔ کہ توجہ کا تعلق لاشعور سے ہے۔ ہماری زندگی کا بڑا حصہ لاشعور کے زیر تحت ہے۔ ان کے تقریباً ہر حصہ میں توجہات سے مختلف طریقوں پر کام لیا جاتا ہے۔ ہمیں ہر وقت توجہات ہوتی رہتی ہے۔ ممکن ہے ان میں سے بعض لاشعور میں چھپی یا دبی رہیں۔ اور آگے چل کر نہایت اہم افعال کی انجام دہی کا باعث ثابت ہوں۔ اس کا ثبوت اس طرح ملتا ہے۔ کہ اگر ایسے امور کا جو آج ہماری زندگی پر غالب اثر رکھتے ہیں۔ عہد گذشتہ کی طرف سراغ لگایا جائے۔ تو ہم اس زمانہ تک پہنچ جاتے ہیں جب بچپن میں کوئی ایسی بات ہمارے ذہن میں جاگزیں ہوئی تھی۔ اور جسے ہم نے بظاہر بالکل فراموش کر دیا تھا۔ چونکہ توجہ کا سب سے زیادہ اثر بچپن میں ہوتا ہے۔ اس لئے اس وقت جو باتیں ذہن نشین ہو جائیں وہ بعد کی زندگی میں نہایت اہم ثابت ہوتی ہیں۔ بہت سے احساسات، خیالات اور جذبات ایسے ہیں۔ جو اگرچہ ہماری روزمرہ کی زندگی کی رو میں شامل نہیں ہوتے۔ لیکن ہم پر بیحد اثر ڈالتے ہیں۔

خواب، خفقان اور دیوانگی کی حالت میں لاشعور اپنے آپ کو حیرت انگیز طریقوں پر ظاہر کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو کچھ ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ اور جو ہم نے اپنے اسلاف سے ورثہ میں پایا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ شعور کے دائرہ سے باہر ہے۔ جو افعال ہم سے عادتاً سرزد ہوتے ہیں۔ لاشعور ان پر اقتدار رکھتا ہے۔ ان عادات میں سے بعض ہم پیدائش کے بعد اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً چلنا اور گفتگو کرنا وغیرہ اور بعض ہمیں نسلاً اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملتی ہیں۔ مثلاً قوت ہاضمہ اور سانس لینا وغیرہ۔ لاشعور، شعور سے بالکل آزاد رہ کر کام کر سکتا ہے۔ اس کی مثال قلب یا معدہ کی حرکت کی صورت میں ملتی ہے۔ جس کا ہمیں شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا۔ اگرچہ شعور اس میں کسی حد تک دخل انداز ہو سکتا ہے۔ غم و غصہ کی حالت میں عروق یا ہاضمہ کے فعل میں فرق آ جاتا ہے۔ اور ہضم بگڑ جاتا ہے۔ اس کی پہلی علامت درد ہوتی ہے۔ تشویش و خوف کے خیالات جب اعصاب کی راہ سے قلب تک پہنچتے ہیں۔ تو اس کی معمولی لاشعوری حرکت میں اختلاج پیدا کر سکتے ہیں۔ اور بعض حالتوں میں اس حرکت کو کلیتہً بند کر کے موت کا باعث بھی ہو جاتے ہیں۔ اسے کماحقہٗ سمجھنے کیلئے نظام عصبی کی ماہیت سمجھنا اور ان کی نالیوں اور اعضاء سے ان کے تعلق پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

نظام عصبی۔ بدن انسانی میں سفید رنگ کے بار یک باریک تاگوں کا ایک جال ہوتا ہے۔ یہ تاریں بتدریج ملتی ہوئی، اور

ڈوریاں سی بناتی ہوئی دماغ یا حرام مغز میں مل جاتی ہیں۔ انہی کو اعصاب یا پٹھے (Spinal cord) کہا جاتا ہے۔ بدن کے تمام افعال حس و حرکت انہی سے متعلق ہیں۔ یہ بجلی کی ان تاروں کی طرح ہیں۔ جو بدن کے مختلف حصص سے اپنے مراکز دماغ اور حرام مغز میں پہنچتے ہیں۔ اور جس طرح مرکز سے بجلی کی طاقت تاروں کے ذریعے مختلف مقامات پر پہنچ کر روشنی اور حرکت وغیرہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ بعینہٖ دماغی قوتیں ان اعصاب کے ذریعے بدن کے مختلف حصوں میں پہنچ کر ان میں حس و حرکت پیدا کرتی ہیں۔ دماغ بجائے خود کروڑوں کوٹھڑیوں سے مرکب ہوتا ہے۔ جن میں ہمارے خیالات اور یادداشتیں درج ہوتی رہتی ہیں۔ شعور دماغ کے بیرونی حصہ (Cortex) میں اور لاشعور نچلے دماغ میں ہوتا ہے۔ شعور میں لاشعور کو زیر تحت رکھنے کی قوت ہوتی ہے۔ لیکن بڑی حد تک آزادانہ طور پر فعل انجام دے سکتا ہے۔ اس سارے نظام کا تعلق دماغ اور نخاع سے ہوتا ہے۔ اس لئے اسے مرکزی نظام عصبی کہتے ہیں۔ اس سے ملا ہوا ایک اور عصبی نظام ہے۔ جو اس کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ اسے نظام شرکیہ کہتے ہیں۔ اس کا خصوصی اثر خون کی نالیوں اور بدن کی مختلف رطوبتوں پر ہوتا ہے۔ یہ دوسرا نظام عصبی جس طرح دماغ کے ہمراہ کام کرتا ہے۔ اسے فعلیاتی لحاظ سے بیان کرنا بہت آسان ہے۔ لیکن اگر ہم فعلیات (Physiology) کو بالائے طاق رکھ کر عام فہم طریقہ سے اس عقدہ کو وا کرنے کی سعی کریں۔ تو یہ امور خرق عادت معلوم ہوں گے۔ مثال کے طور پر شرم و حیا کا خیال دل میں آتے ہی خون رخساروں پر پھیل جاتا ہے! آخر یہ خیال عصب کے ساتھ ساتھ کیونکر گزرتا ہے۔ اور اس میں دوران خون میں تبدیلی پیدا کرنے کی طاقت کیسے آجاتی ہے؟ اس کا جواب صرف فعلیات کے پاس ہے! ایک اور سوال ہے کہ کروڑوں دماغی خانے خیال کے عمل میں کس طرح حصہ لیتے ہیں! کیا وجہ ہے کہ ہمیں کوئی بات فراموش نہیں ہوتی۔ بلکہ لاشعور میں جمع ہو جاتی ہے! جہاں سے ہم اسے قوت ارادی کی شعوری کوشش سے یا لاشعوری حالت تنویم میں اس ذخیرہ سے نکال سکتے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ کہ جو کچھ ہم سوچتے ہیں یا جن یادداشتوں کو اپنے لاشعور میں جمع کرتے ہیں۔ وہ ہمارے خد و خال، آنکھوں کی چمک، رنگ حتّٰی کہ آواز تک میں بعید تبدیلی یا ترمیم کر سکتے ہیں۔ خیالات انسان کی چال ڈھال پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ چنانچہ انسان کے کردار کی قابل ذکر باتیں اس کا چہرہ دیکھے بغیر پشت کی طرف کھڑے ہو کر اس کی چال ڈھال سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ صرف سن و سال سے ہی انسان کی ہیئت تبدیل نہیں ہوتی۔ بلکہ غم و اندوہ سے بھی اس کی شکل و صورت بدل سکتی ہے۔

توجہ کیسے عمل کرتی ہے۔ اس بات کا عام طور پر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم اکثر امور کو بلا استعجاب محض اس لئے تسلیم کر لیتے ہیں۔ کہ ہم ان کے روز اول سے عادی ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں یاد ہو کہ اگر ہم کسی قدر منتقد نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ تو یہ خرق عادت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ شرم و حیا یا حسرت و ابتہاج سے چہرہ پر اس قدر خون جمع ہو جاتا ہے کہ جلد گرم ہو جاتی ہے۔ چونکہ ہم اس امر سے واقف ہیں اس لئے یہ حیرت خیز نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ حالت تنویم میں بدن کے کسی حصہ میں حدت پیدا کی جا سکتی ہے۔ تو اکثر اشخاص اسے قابل یقین نہیں سمجھیں گے۔ ایک اور مثال سے اس کی وضاحت ہوتی ہے بعض لوگوں کو جب کسی بات پر رنج پہنچتا ہے۔ تو ان کے خیالات کا اثر امعاء پر پڑتا ہے۔ اور اسہال کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس بات کو سمجھتے ہوئے بھی بہت سے لوگ تسلیم نہیں کریں گے۔ کہ مناسب توجہات سے امعاء کے تحرک پر مفید اثر پڑتا ہے۔ اور ان سے قبض کا تدارک بعض اوقات فوراً اور بعض حالتوں میں بتدریج ہو جاتا ہے۔ فی الحقیقت یہ سمجھنے کے لئے کہ تنویم سے امراض کا علاج کیسے ہوتا ہے روزمرہ کے معمولی مظاہر کو سمجھنا (جن سے ہم واقف ہیں) کافی ہے۔ حالت تنویم میں ان مظاہر کے تیز ہونے کا باعث یہ ہے کہ اس وقت نفس پر لاشعور کا حاوی ہونے کے باعث معمول میں اثر پذیری کی طاقت بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔

توجہ کی کارکردگی کو سمجھنے کے لئے شعور اور لاشعور کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ دونوں متواتر مل جل کر کام کرتے رہتے ہیں۔ جب بچہ چلنے کی کوشش کرتا ہے یا کوئی شخص باجہ بجانا سیکھتا ہے۔ تو دونوں صورتوں میں ہر حرکت ایک تکلیف دہ اختیاری کوشش کے ساتھ کی جاتی ہے۔ لیکن مبادیات سیکھ لینے کے بعد لاشعور خیالات ارسال کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ہم اپنے کاموں کو بڑی آسانی کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں۔ بلکہ اگر ضرورت ہو تو ہم لاشعور کے سپرد ہی کر دیتے ہیں۔ جس سے ہمیں اختیاری کوشش کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ ایک طرف ہم باجہ بجاتے ہیں۔ اور دوسری طرف گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رکھ سکتے ہیں۔ چلتے چلتے عمیق مسائل حل کر لیتے ہیں۔ اور ان میں اتنے محو ہو جاتے ہیں۔ کہ جہاں جانا تھا۔ وہاں سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ اس قسم کی مثالوں

سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ہماری روز مرہ کی شعوری زندگی میں لاشعور کا کس قدر دخل ہے۔ یہ دخل ہمارے مختلف محسوسات کے ذریعے پیدا ہو سکتا ہے۔ جیسے کہ کسی لفظ کا سننا یا بو کا سونگھنا یا معمولی سی چیز کا دکھائی دینا کافی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوستوں سے گفتگو کرتے ہوئے ایکا ایکی ہم کہیں کے کہیں جا پہنچتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ دوستوں کی گفتگو نے اس فراموش شدہ یاد کو ہمارے دل میں تازہ کر دیا۔ جو بالواسطہ لاشعور میں موجود تھی۔ اور ہمیں نامعلوم ان باتوں سے تعلق بعض اوقات یہ امر نا قابل بیان ہوتا ہے اور ہم اپنے احساسات کی وضاحت نہیں کر سکتے۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ کسی نامعلوم طریقہ سے ہمیں ان باتوں کی یاد آگئی۔ جو شعور کے دائرہ سے باہر ہیں۔

نیند کی حالت میں ذہن پر لاشعور کی حکومت ہوتی ہے۔ حقیقت میں اس حالت کو ہم آج تک کما حقہ نہیں سمجھ سکے۔ بیداری کی حالت کو ہم اپنی زندگی کا مثبت حصہ سمجھتے ہیں۔ اور نیند کی حالت کو منفی حصہ قرار دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری زندگی پر اس کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ نیند کی حالت میں بھی ہمارے قوائے ذہنی غیر معمولی طور پر تیز ہوتے ہیں۔ خواب کا مطالعہ کرنے سے یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ یہ ہمارے خیالات وافعال کے سلسلے لاشعور کا ہی عکس ہوتے ہیں۔ خواب بجائے خود لاشعور میں جمع ہو کر ہمارے خیالات پر خود توجہ کی طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

توجہات کی کار فرمائی ۔ ہم جو کچھ دیکھتے، سنتے، پڑھتے اور کرتے ہیں۔ ان سے ہم اثر قبول کرتے ہیں دوسرے الفاظ میں توجہات ہم پر روزانہ اثر ڈالتی ہیں۔ جن میں سے ہم بعض کو تسلیم کر کے ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک بظاہر ہمیں فراموش ہو جاتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں ہمیشہ کے لئے ہمارے لاشعور میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور ہماری زندگی پر اثر ڈالتی رہتی ہیں۔ یہ توجہات [illegible] ملتی ہیں۔ خواہ ان کے ارتقاء میں مدد دیں یا سد راہ ثابت ہوں۔ یہ علیحدہ سوال ہے۔ کہ ان کی رکاوٹ کس قدر مضر ہو۔ جیسے [illegible] ہے۔ لیکن جس کام کو ہم ذرہ نہیں کر سکتا۔ اسے یقیناً ان کی دلیل کر سکتی ہے۔ لاشعور نہ صرف ہمارے ساتھ ہی منصہ شہود پر آتا ہے۔ اور اپنے ساتھ اسلاف کا صدیوں کا ورثہ لاتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی کہیں قبل کا ــــــ انسان کی ذہنی اور جسمانی ارتقاء میں تبادل کیا لاکھوں برس صرف ہوئے ہیں۔ ان کے نشانات ہمارے جسم کے علاوہ ذہن میں بھی موجود ہوتے ہیں۔ ہمیں تاریکی کا خوف صرف اسی لئے ہے۔ کہ ہمارے ذہن میں زمانہ قبل از تاریخ کی لاشعوری یاد موجود ہے۔ جب انسان کو رات کے وقت بڑے احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا۔ کہ کہیں دشمن کسی جھاڑی کے پیچھے چھپا ہوا نہ ہو۔ اور بے خبری میں ہی نہ آ لے۔ قانون ارتقاء کی وجہ سے خرگوش کے کان لمبے ہوتے ہیں جو اسے ہلکی سی سرسراہٹ سے خبردار کر کے موت سے بچا لیتے ہیں۔ ہمیں اپنے والدین سے ترکہ میں صرف جائداد ہی نہیں ملی۔ بلکہ اکثر ہماری شکل وصورت اور عادات واطوار بھی ان سے مشابہ ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے کہیں اہم لاشعور میں ہمارے والدین کے اثرات ہوتے ہیں۔ استقرار حمل کے بعد فوراً تک جب رحم میں جنین نشوونما پاتا ہے۔ ماں کے خیالات اور ذہنی حالت بچہ کے ذہن پر برابر اثر کرتی رہتی ہے۔ مشہور انگریز طنز نویس برنارڈ شا (Bernard Shaw) اپنے مخصوس انداز میں ایک چبھتا ہوا فقرہ لکھتا ہے کہ "ہمیں اپنے والدین کے انتخاب میں احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے"۔

واقعات کی عام رفتار یہ ہوتی ہے۔ کہ توجہ ذہن میں پہنچ کر خیال کی صورت اختیار کرتی ہے۔ جو اسے عمل کا جامہ پہنا دیتی ہے۔ یہ ممکن ہے۔ کہ اس عام رفتار میں کسی منزل پر رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ جیسے کسی مشین کا کوئی پرزہ ٹوٹ جائے۔ تو وہ رک جاتی ہے۔ واضح الفاظ میں توجہ ذہن تک نہ پہنچے۔ ظاہر ہے۔ اس صورت میں خیال پیدا ہی نہ ہو گا یا خیال پیدا ہو۔ لیکن بعید از اختیار ہونے یا [illegible] کے باعث عمل کی صورت اختیار نہ کرے۔ مثلاً ایک فقیر بازار میں بھیک مانگ رہا ہے۔ جس سے ہر راہرو کے دل میں خیرات دینے کی توجہ پیدا ہوتی ہے۔ بعض لوگ بھکاریوں کے ہتھکنڈوں سے واقف ہوتے ہیں اس لئے

ان کا ذہن ان کے متعلق کند ہو جاتا ہے۔ اور توجہ خیرات دینے کا خیال ہی پیدا نہیں کرتی۔ کچھ میں خیال پیدا ہوتا ہے لیکن مزاحمت اسے فعل کی صورت بننے نہیں دیتی۔ تیسری صورت یہ ہے۔ کہ وہ خیرات دینا بھی چاہتے ہے۔ لیکن استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے قاصر رہتے ہے۔ اس قسم کی مثالوں میں ایک عام شخص کیلئے تو ذہنی دلچسپی کے سوا اور کوئی بات نہیں ہے لیکن معالج کیلئے بسا اوقات یہ نہایت اہم ہوتی ہے۔

بر روز ہم توجہات قبول کرتے ہیں۔ بسا اوقات یہ غیر متوقع طریقہ پر ہم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ فوری مسرت جس کی بہت سی صورتیں ہیں۔ حصولِ صحت کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ جب عصبی تکالیف کو دُور کرنے کے تمام طریقے ناکام رہیں۔ اور کوئی علاج کارگر نہ ہو۔ تو مسرت میں یہ قوت ہے کہ وہ صحت عطا کرے۔ ایسی حالت میں چند دن میں مرض کی علامات دُور ہو جاتی ہیں اور آنکھوں میں چمک اور چہرہ پر رونق آجاتی ہے۔ صحت کا یہ ذریعہ ایسا ہے کہ اس پر معجزہ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ مسرت کی ان صورتوں میں سب سے بااثر محبت ہے۔ یہ امر محتاج تصریح نہیں ہے کہ ایک شخصیت دوسری پر کسقدر دُوررس اثر ڈال سکتی ہے۔ یہ اثر قلیل عرصہ میں عادات اور کردار میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ بعض اوقات حالات بھی توجہات کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اور بالآخر فعل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک شخص دخت رز کا والہ و شیدا ہے۔ اور اپنی ساری آمدنی اس پر صرف کر دیتا ہے۔ اس کی بیوی تپ دق کا شکار ہے اور مشکل تمام گھر کا کام کاج کرتی ہے۔ خاوند اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ لیکن ایک وقت آتا ہے۔ کہ اس کی بیوی کو شفا خانہ پہنچانا پڑتا ہے اس معمولی سے واقعہ کا اس پر اتنا گہرا اثر پڑتا ہے۔ کہ وہ شراب خانہ خراب کو ترک کر دیتا ہے۔ اور شرافت سے زندگی بسر کرنے لگتا ہے اس مثال سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کہ ہر حالت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ حالات یا شخصیت کا کیا ذکر کبھی خاص حالت میں انسان کوئی ایک لفظ یا فقرہ ہی ایسا سُنتا ہے۔ جو اس کے دل لگتا ہے۔ اور اس کی زندگی بدل دیتا ہے۔

(صفحہ ۔۔ کا بقیہ)

سکتی ہیں۔ اگر بعض اوقات ان کے مبتلا کے سامنے ان کے نفس اور ان سے پیدا ہونے والے افعال کا آئینہ دکھا کر ان پر بصورت تصویر رکھ دیا جائے بسا اوقات طور پر یکساں قسم کے مریضوں میں مثلاً ایک شخص کا چہرہ ایک مخصوص قسم کی خارش ہے۔ اتفاق سے وہ دوسرے شخص کو بعینہ اسی قسم کی خارش میں مبتلا دیکھتا ہے۔ بالعموم وہ توجہ پذیری کی استعداد کے درجے تک نہ جانے اس قسم کی خارش کا شکار نہیں ہوتا۔ اس اصول کے مطابق بچوں میں جو توجہ قبول کرنے کیلئے بہت زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس قسم کی شفایابیوں کی زیادہ وضاحت ہوتی ہے) اس کا قاعدہ کامل الفقیر جو ہمیں اب تک معلوم ہو سکا ہے۔ گہرے تنویمی عمول کو بطور تقال کے استعمال کرنا ہے۔

تنویم کا نظریہ

مقناطیسیت اور تنویم کے اکثر نظریوں کا ذکر ابواب ماسبق میں ہو چکا ہے۔ ان کی کسی قدر مزید وضاحت کے بعد بعض جدید نظریے پیش کئے جائیں گے۔

مسمر ۱۷۷۸ء "صحت و مرض کا دار و مدار بدن کے ایک قسم کے مقناطیسی سیال کے بہاؤ پر ہے۔ جھالوں وغیرہ سے اس کے بہاؤ کو بڑھایا اور بدن کے مختلف حصوں میں پہنچایا جا سکتا ہے۔"

رائیشن بیخ سن ۱۸۳۶ء ایلیٹسن ۱۸۴۵ء "مسمریزم کے مظاہر کا تعلق ایک خاص قوت یا سیال اوڈیلک (Odylic) سے ہے۔ ایلیٹسن نے مسمریزم کے اثرات کی تشریح ان عجیب الفاظ میں کی تھی "یہ یقین کرنے کی معقول وجہ ہے کہ ایک فرد کا حیات بخش سیال دوسرے کے بدن میں پہنچایا جا سکتا ہے۔ خداوند قدوس نے جسم انسانی میں ایک قابل انتقال حیات بخش شفائی قوت پنہاں کی ہے۔ جب دو افراد اکٹھے ہوں تو اکثر حالات میں صحت مند فرد مریض میں اپنی قوت کا کچھ حصہ منتقل کر کے اسے آسائش بہم پہنچا سکتا ہے۔"

بریڈ ۱۸۴۲ء اس نے تنویم کے عملی پہلو پر غور کر کے ایک اہم قدم اٹھایا۔ اس کے ہمراہ اس نے امراض کے علاج میں اس سے کام لیا۔ تنویم طاری کرنے کے ابتدائی طریقے کے ذریعے جس میں وہ اپنی نظر کسی چمکدار شے پر جماتا تھا! اس نے ایسے نتائج حاصل کئے جن پر کوئی دوسرا نہیں پہنچا تھا۔ تنویم کی بیہوشی کو وہ "مصنوعی طور پر پیدا شدہ نیند" قرار دیتا تھا۔ اس کیلئے اس نے ہپناسس (Hypnosis) کی اصطلاح استعمال کی۔ ابتدا میں اس کا عقیدہ تھا کہ کسی ایک خیال پر ذہن مرکوز کرنے سے یہ حالت اس لئے پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ ایسا کرنے سے باقی عصبی مراکز بے اثر ہو جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں نیند طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن بعد میں اس کے خیالات تبدیل ہو گئے۔ کیونکہ اس کے مشاہدہ میں یہ بات آئی کہ اس کے زیر علاج دو کس شفایاب ہو گئے۔ صرف دس فیصدی پر گہری نیند طاری کی جا سکتی ہے۔ اور معمول کا اختیار زائل نہیں ہوتا۔ جگر اگر یہ ہو۔ تو تنویم کے اثرات کو روکا جا سکتا ہے۔ اس پر اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ مظاہر فی الحقیقت صرف توجہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ نیز مقناطیسیت کے اثرات اور نیند طاری کرنے کے دیگر ذرائع کی تشریح بھی اس نظریہ سے ہو سکتی ہے۔ ان امور کے پیش نظر اس بریڈ نے ذہن اور آنکھوں کو چمکدار اشیاء پر مرکوز کرا کے حالت تنویم پیدا کرنے کے طریقے کو چھوڑ دیا۔ اور محض "زبانی توجہ" سے کام لینا شروع کیا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے دریافت کیا۔ کہ بعض لوگ خود اپنے آپ پر تنویم طاری کر سکتے ہیں۔ اس نے ان نظریوں کی بنا رکھی جن میں مظاہر تنویم کی تشریح ذہن کی بیداری کو تسلیم کر کے کی گئی ہے۔ ان کی وضاحت آگے چل کر مائرز، سائڈیس اور دیگر ماہرین نے کی۔ بریڈ نے حالت تنویم میں بعض تجربات کئے جن کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ شعور کی دو حالتیں ہوتی ہیں یعنی شعور اور تحت شعور۔ اس نے مشاہدہ کیا۔ کہ جن معمولوں کو وہ بحالت تنویم اطالوی، اطالین اور فرانسیسی زبانیں سکھاتا ہے۔ جب وہ تنویم سے بیدار ہوتے ہیں۔ تو سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ لیکن جب ان پر دوبارہ عمل تنویم کیا جائے۔ تو انہیں سیکھی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ اسے اس امر کا یقین تھا۔ کہ حالت تنویم میں ذہنی تحریک تیز ہونے کے علاوہ اخلاقی احساس بھی بڑھ جاتا ہے۔

لیبالٹ (فرانسیسی مکتب) ۱۸۶۴ء اس نے اس امر پر زور دیا۔ کہ مظاہر تنویم کی تشریح صرف توجہ سے ہو سکتی ہے۔ وہ حالت تنویم پیدا کرنے کیلئے مقناطیس یا جھالوں سے کام نہ لیتا تھا۔ اور نہ ہی کسی چیز کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کی ہدایت کرتا تھا۔ اس کی بجائے وہ مریض کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لیتا۔ اور پھر تفصیل سے نیند کیلئے توجہ دے کر غنودگی کی حالت پیدا کر دیتا تھا۔ اس کے بعد مریض کو جس مرض کے علاج کے لئے آیا ہو۔ دور کرنے کے لئے توجہ دی جاتی تھی۔ مثلاً جس شخص کو درد کی شکایت ہو۔ اسے درد رفع ہونے کے لئے اور جسے [illegible] لاحق ہو۔ اسے چھٹنے کے لئے توجہ دی جاتی تھی۔

برنہیم ۱۸۸۴ء اس نے دنیا کے سامنے ذہنی علاج کا طریقہ پیش کرنے کے علاوہ یہ بتایا۔ کہ تنویمی نیند پیدا کئے بغیر مظاہر تنویم کسی حد تک پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اس نے علاج بالتنویم کو بالکل سادہ بنا دیا اور ثابت کیا کہ تنویم سے کام لینا بھی ضروری نہیں ہے۔ برنہیم کا قول ہے "تنویمی نیند معمولی نیند ہے۔ اور تنویمی توجہ معمولی حکم۔ تم مریض کو حکم دو کہ سو جائے۔ وہ یقیناً سو جائیگا۔ تم اسے حکم دو کہ اچھا ہو جائے تو وہ یقیناً اچھا ہو جائیگا۔" لیکن بدقسمتی سے ان دونوں کا اصل طریق علاج سے واسطہ و رابطہ۔ ان کا تجربہ اس امر کا شاہد ہے۔ کہ اکثر حالات میں

ایسی خبری کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ والعقل دقات متقدیہ عرصے کے ای صحت ہوتی ہے۔

شارکٹ (سالپٹریئر مکتب ۱۸۶۸ء) ان کا عقیدہ تھا۔ کہ تنویم کے مظاہر ہسٹیریا کی مانند ہیں۔ اور یہ اس مرض کے مریضوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مقناطیسیت کے ابتدائی عاملین کی طرح ان کا یہ بھی خیال تھا۔ کہ یہ مظاہر مقناطیس اور دوسری دھاتوں سے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ شارکٹ کے عقائد کو صحیح تصور کرنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ قریباً تو سے فیصدی لوگ ہسٹیریا کے مرض میں مبتلا ہیں۔

فریڈرک مائیرز اور گرنتھا کا نظریہ مائیرز، گرنی اور دوسرے ماہرین نے دوہرے شعور کے نظریہ کی تشریح کی ہے۔ اس کی بنیاد اس امر پر ہے۔ کہ شعور کی دو رویں ہیں۔ ایک بالائی (Supraliminal Self) اور دوسری زیریں (Subliminal Self) آخر الذکر سے مراد تحت الشعور ہے۔ ان دونوں کا اجتماع ہماری ذات کی حقیقت سے سمجھا جاتا ہے۔ ممکن ہے دونوں حصے مل کر کام کریں۔ یا نفس لاشعور جداگانہ طور پر کام کرے۔ دوسری صورت کی بہترین مثال بحالت خواب دیکھی جا سکتی ہے۔ چونکہ اس وقت نفس شعور التوا میں ہوتا ہے۔ اس لئے نفس لاشعور میں مسائل حل کئے جاتے ہیں۔ انسان خطرناک مقامات میں سے گزرتا ہے۔ اور ایسے ایسے کام کر گزرتا ہے۔ جو شعوری حالت میں اس کے لئے یقیناً ناممکن ہوتے ہیں۔

کہا جاتا ہے۔ کہ آر ایل سٹیونسن خود توجہی کے ذریعے اپنی مرضی کے مطابق خواب دیکھا کرتا۔ اور ان سے نئے نئے افسانے تحریر کرنے میں مدد لیا کرتا تھا۔ زندگی کے روزمرہ بازار میں بھی اس قسم کے بعض مظاہر دیکھے جاتے ہیں۔ جن سے نفس لاشعور کے افعال کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ہم کسی نام کو یاد کرنے کی بہت کوشش کرتے ہیں۔ مگر وہ یاد نہیں آتا۔ اس کے بعد وہ ایکا ایکی یاد آ جاتا ہے۔ حالانکہ اس وقت ہم اس پر غور و فکر ترک کر چکے ہوتے ہیں۔ اس امر سے ہم اس قدر واقف ہیں۔ کہ بارہا کہہ دیا کرتے ہیں۔ "اگر میں نے اس کی نسبت سوچنا چھوڑ دیا تو یہ بات ضرور یاد آ جائے گی۔" ایک سادہ مثال لیجئے۔ اگر ہم کسی نئے موضوع کی کوئی کتاب پڑھ رہے ہوں۔ اور اس میں کوئی دقت پیش آئے جو کسی طرح حل نہ ہو۔ اگر ہم اس کتاب کو بند کر کے اس کا خیال چند دن کیلئے بالکل ہی چھوڑ دیں۔ تو اکثر یہ مشکل خود بخود حل ہو جاتی ہے۔

جس طرح نفس لاشعور طبعی نیند میں ظاہر ہوتا ہے۔ بعینہٖ اس سے متعلقہ حالات یعنی تنویمی نیند میں ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے۔ آخر الذکر حالت میں اس کے اثرات کا اندازہ طبعی نیند سے بہتر طریق سے کیا جا سکتا ہے۔ حالت تنویم میں نفس لاشعور کا بہت کچھ مشاہدہ کرنے کے بعد مائیرز اور دوسرے ماہرین بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے۔ کہ اس کا دائرہ تحریکات عضویاتی اور نفسیاتی دونوں لحاظ سے نفس شعور کی نسبت بہت وسیع ہے۔ اس کا نظام عصبی، قلب اور عروق دمویہ (خون کی نالیوں) پر غیر معمولی اختیار ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس میں ایک اعلیٰ ذہنی تحریک اور ارفع اخلاقی احساس پایا جاتا ہے۔ مائیرز نے بیان کیا ہے۔ "یہ ممکن ہے۔ کہ وہ باتیں جنہیں ہم الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ دراصل نفس لاشعور کے مظاہر ہوں۔ اگر یہی وجہ ہے۔ کہ انہیں شعوری طور پر ظہور میں نہیں لایا جا سکتا۔ بلکہ ہمیں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کہ کوئی نامعلوم قوت اس میں تحریک پیدا کرے۔

حالت تنویم میں انسان کا شعوری نفس سویا ہوا ہوتا ہے۔ اور نفس لاشعور بیدار اور ہوشیار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہر قسم کی تجویز براہ راست اس تک پہنچتی ہے۔ اور وہی اس کے سامنے سر تسلیم خم کر کے ان پر عملدرآمد کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ یہ عمل اسی وقت ہو یا چند گھنٹہ یا چند روز بعد ہو۔ ہم جو جسمانی تغیرات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ توجہ ان کے متعلق ہو سکتی ہے۔ مثلاً سوء ہضم اور قبض وغیرہ۔ توجہ کے ذریعے کند ذہن بچوں میں ذہانت پیدا کی جا سکتی ہے۔ نیز اس کے ذریعہ اخلاق کو ارفع بنایا جا سکتا ہے۔

ماہرین کے تجربہ کی بنا پر (جن کی رائے اس کے متعلق حجت [illegible]) یہ امر جانتے ہوئے کہ حالت تنویم میں نفس لاشعور سے جو اپیل کی جائے۔ وہ حیرت انگیز طور پر کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ حالانکہ وہی بات شعوری حالت میں بار بار کہنے پر بھی کامیابی نہیں ہوتی۔ لیکن اکثر اوقات یہی کامیابی نفس شعور سے اپیل کر کے حاصل ہوتی ہے۔ بشرطیکہ اس کا اثر ادراک تک پہنچ جائے ہر قسم کے ذہنی اور نفسی علاج میں اس امر کا پیش نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔

ڈاکٹر ہیڈن ہین کا نظریہ اس نے حالت تنویم کو یکساں قسم کی ہلکی حرکت سے منسوب کیا ہے۔ جس سے ایک حس اپنا فعل انجام دینے میں تیز ہو جاتی ہے۔ اور اس کے اثر سے غلافات دماغ میں کئے اعصاب اپنا کام چھوڑ دیں۔ اور آخری نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اعلیٰ دماغی اعصاب کے عمل میں بھی فتور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے یکساں قسم کی آواز یا ایک ہی حرکت کا مسلسل عمل غنودگی یا خواب طاری کر سکتا ہے اور دفعتاً تیز قسم کی تحریک مثلاً شور یا روشنی کی چمک سوئے ہوئے انسان کو بیدار کر دیتی ہے۔ جب کبھی کسی شخص کی نظر کسی چمکدار چیز پر قائم کر کے

تنویم کا نظریہ

گہری تنویم طاری کی جاتی ہے۔ دراصل حقیقت کیا عمل واقع ہوتا ہے؟ چونکہ اس کی توجہ سب طرف سے ہٹا کر صرف ایک حسی نقش پر مرکوز کرائی جاتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے گردوپیش کے حالات سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ حتٰی کہ وہ صرف اسی چیز کو دیکھتا ہے۔ اور دوسری کوئی چیز اس کے پیش نظر نہیں رہتی۔ لیکن تھوڑا عرصہ کے بعد مرکز بصارت کام سے رہ جاتے ہیں۔ اور مسلسل تحریک کے اثر سے متاثر ہونے کی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہتی۔ تو بصارت کا احساس بھی ان سے سلب ہو جاتا ہے۔ اور معمول دماغی خلاء یا بے احساسی کی حالت میں رہ جاتا ہے۔ صحت مند اشخاص اپنے حواس کی شاہراہوں سے مسلسل مختلف قسم کے نقوش حاصل کرتے اور ان کا موازنہ کرتے رہتے ہیں۔ انسان کی اس معمولی حالت کو کثیر الخیالی (Polyideism) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جب انسان مندرجہ بالا حالت میں پہنچتا ہے۔ تو کثیر الخیالی کی حالت سے نکل کر پہلے واحد الخیالی (Monoideism) کی حالت میں آتا ہے۔ یعنی صرف ایک معین نقش کا خیال جس پر اسے اپنی نظر اور توجہ کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔ اور بالآخر خلو دماغ (Vacuity) کی حالت میں پہنچ جاتا ہے۔ جس میں خیالات کامل طور پر معدوم ہو جاتے ہیں۔

اب دماغ کے کمرے میں جس کی بخوبی صفائی کر دی گئی ہو۔ عامل جو خیال چاہے بٹھا سکتا ہے۔ اور جس طرح کسی تاریک کمرے میں روشنی کی ایک ہلکی سی کرن داخل کی جائے۔ تو وہ گردوپیش کی سیاہی اور دوسری کرنوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے بہت زیادہ روشن اور چمکدار دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح سے جس شخص پر گہری تنویم طاری ہو۔ اس کی قوت متخیلہ پر جس خیال کی توجہ دی جائے۔ اس کا اثر بہت زیادہ اور گہرا ہو گا۔

جب ایک شخص کسی مرض سے بیہوش ہوتا ہے۔ تو جسم اور دماغ دونوں کامل طور پر معطل ہو جاتے ہیں۔ تنویم سے پیدا شدہ خواب گراں کی صورت میں عامل کے حکم سے اس حالت کو جزوی یا کلی طور پر رفع کیا جا سکتا ہے۔ عامل اس امر کی قدرت رکھتا ہے۔ کہ معمول کے کسی مرکز کو اس سے کہیں زیادہ کام کرنے کے لیے اکسائے۔ جتنا وہ معمولاً کرتا ہے۔ یہاں تک کہ مریض یا معمول جس کی ناک سے اگر ایک لحظہ پیشتر امونیا لگائی جاتی بلحاظ تیز بو ہونے کی خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ اب ہلکی سے ہلکی بو کو بھی محسوس کرنے لگیگا۔ اور وہ شخص جو اس حالت میں پڑا ہے۔ کہ اس کے اعصاب بیکار ہیں عامل کے اشارہ سے قوت کے غیر معمولی کمالات دکھلانے لگیگا۔ ... کے اظہار کے لئے بھی یہی استدلال مطابقت رکھتا ہے۔ نہایت نکبت و افلاس کی حالت سے معمول کو چشم زدن میں امیرانہ زندگی کی رنگ رلیوں میں پہنچایا جا سکتا ہے۔ ... کہ معمول ہر دو حالتوں کے احساس کو بیداری کے مقابلہ میں نہایت نمایاں طریق پر ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے کہ ہوش و حواس کی موجودگی کی صورت میں انسان کے جذبات مخالفانہ اثرات کے تابع ہوتے ہیں۔ جسے ضبط نفس (Self - Control) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب مریض یا معمول خوابگی (سومنابولزم) کی حالت میں ہو۔ تو اس ضبط نفس کا نشان بھی نہیں ہوتا۔ نتیجتاً ہر ایک خواہش اور ہر ایک جذبہ جس کی توجہ دی جائے اپنا پورا پورا اثر پیدا کرتا ہے۔

برنہیم کی رائے میں تنویم سے ارادیت (Will) یعنی سوچ بوجھ کر اپنی خواہش سے اور بیان بیجان کر دماغ کے کام کرنے کی صلاحیت مسلوب ہو جاتی ہے۔ اس کا دوسرا رخ لاشعوری طور پر (بے سوچے سمجھے) اور جبلت کے مطابق کام کرتا ہے۔ اس لئے یہ رخ جبلت کی خوب جولانی دکھاتا ہے۔

جس حد تک ایک شخص کے اعمال کا انحصار دلائل کی بجائے من کی ترنگ پر ہوگا۔ اسی حد تک بیرونی نقوش کے تاثر کی صلاحیت اس میں بڑھی ہوئی ہوگی۔ ڈاکٹر لائیڈ ٹکی نے تحریر کیا ہے۔ کہ جو شخص اپنے حیوانی جذبات کی اطاعت کرتا ہے۔ اور دوسرے کو جو اس کے ساتھ معمولی سی سخت کلامی کرے۔ اٹھا کر پٹخ مارتا ہے (بشرطیکہ یہ فعل عادتاً اور لاشعوری طور پر ہو) ایسے شخص پر عمل تنویم نہایت آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ بہ نسبت اس کے جو ایسے موقع پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے سپاہی کو بلائے اور پھر عدالت میں ہتک عزت کا مقدمہ دائر کرے۔"

لارڈ برمٹن کا نظریہ لارڈ برمٹن نے تنویم کے مظاہرات کی توضیح علم الطبعیات سے کی ہے۔ یعنی روشنی کی کرنیں جس طرح آواز کی لہروں کے ساتھ ہر ایک خاص تناسب کے ماتحت متصل ہو کر ایک دوسرے کے عمل میں خلل انداز ہوتی ہیں۔ اور جب روشنی کی دو کرنیں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح متصل ہوں۔ کہ ان کی لہریں جن پر وہ مشتمل ہیں۔ ایک سیدھ میں مل جائیں۔ تو روشنی تیز ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ اس طرح خلط ملط ہوں کہ ایک کرن کی لہر دوسری کرن کی لہر کے قعر میں گھس جائے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ دونوں ایک دوسرے کے عمل میں مخل ہوتی ہیں۔ اور دونوں کی طاقت زائل ہو کر تاریکی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس نظریہ کہ اگر نظام عصبی استدلال کے ساتھ منطبق کیا جائے۔ تو نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ عصب کی قوت عصبیہ لہر کی صورت میں

سفر کرتی ہے۔ اور جب تک اس کا انصال اس صورت میں ہوتا ہے۔ کہ ---- لہر کی دھار ایک دوسرے کے ساتھ دھارا اور قعر کے ساتھ قعر ملتا ہے۔ تو احساس یا حرکت اسی فعل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس اتصال سے دوسری صورت (خلط ملط) پیدا ہو۔ تو احساس سلب ہو جاتا ہے اور بجسی پیدا ہو جاتی ہے۔ روشنی کی لہروں میں خلل پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے۔ کہ ان کو مختلف درازی کے راستوں سے گذارا جائے۔ تاکہ جب ان کا اتصال ہو۔ تو ایک دوسرے کے آدھی دھار تک پیچھے ہے۔ اور ایک کی دھار دوسرے کے قعر تک پہنچے۔ یہ صورت نظام عصبی میں ہر وقت پیش آتی رہتی ہے کیونکہ عصابی قوت کی احساسی لہریں مرکز کی طرف مختلف درازی والے راستوں سے گذرتی ہیں۔ اس کا نتیجہ جیسا کہ استدلال کیا جا سکتا ہے یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک دوسرے کے لئے مخل ثابت ہوتی ہیں۔ تمام عصبی مشینری حالت صحت میں ایک توازن کے تابع ہوتی ہے۔ اور احساس اور تحریکی اعصاب کے درمیان یہ توازن لاشعوری طور پر (خود بخود) برقرار رہتا ہے۔ اعلیٰ مراکز سے جو احساسی تحریک طبعی طور پر پہنچتی ہے۔ وہ اس پیچیدہ مشین میں اپنا اثر کرتی ہے۔

جب گدگدی کی جاتی ہے۔ تو احساس اعضاء پیدا ہوتی ہے ---- تحریک کرتے ---- پیدا ہو جاتی ہے۔ اور احساس ---- میں ایک احساس پیدا ہوتا ہے۔ جس کی ترکیب لہروں سے ہوتی ہے۔ اس کا انعکاس تحریکی اعصاب میں ظاہر ہوتا ہے۔ چونکہ تحریک ایک ہی قسم کی اور مسلسل ہوتی ہے۔ اور اس کی لہریں تیزی اور ایک ربط کی ہوتی ہیں۔ ان میں کسی قسم کا خلل پیدا نہیں ہوتا۔ اور قوت محرکہ سے جو ہل چل پیدا ہوتی ہے۔ وہ اس کا انعکاسی نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن جب اس کو بتدریج بڑھا دیا جائے۔ کہ گدگدی درد کی حد تک پہنچ جائے۔ تو عصبی راستے سے مگر درمیانی لہر گذرنے کی بجائے مختلف درازی کے اعصابی راستوں سے بے قاعدہ اور تیز لہریں گزرنے لگتی ہیں۔ اس طرح رکاوٹ اور خلل سے متاثر ہو کر جب یہ لہریں مرکز تک پہنچتی ہیں۔ تو قوت متحرکہ کی ساختیں پیدا کرتی ہیں۔ اور اس فعل کا اصلی انعکاس ظاہر ہونے سے رہ جاتا ہے۔ ایک خاص حد تک طبعی خواہش کا عمل نوری حرکات کا محرک ہوتا ہے۔ اور رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر کار اعلیٰ مراکز کی خواہش قوت محرکہ کی لہروں کے ساتھ بمقدار زور سے ٹکراتی ہے۔ کہ گڑبڑ اور بجسی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہندا بجسی مخصوص اعصاب کے مخصوص ریشوں اور مخصوص خانوں کا کوئی خاص فعل نہیں ہے۔ یہ احساسی اور تحریکی خلیوں کے جذب سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان خانوں کی ترکیبی تاثیر پر اس کا انحصار نہیں ہوتا۔ بلکہ دوسرے خانوں اور ریشوں کے ساتھ ان کا جو تعلق پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس پر منحصر ہے۔

حرکت، احساس، بجسی یا تحریک فی نفسہ اصل نہیں۔ بلکہ محض نسبتی اصطلاحات ہیں۔ اور تحریکات کی جو لہریں اس خانہ سے پہنچتی ہیں (اس فاصلہ کے مطابق جس پر یہ پھیلتی ہیں۔ اور جس سے ترغیب کا وہ اثر ظاہر ہوتا ہے۔ جسے انعکاس کہتے ہیں) ان کے درمیان جو تناسب ہوتا ہے۔ ان کے مطابق احساسی حرکت اور بجسی کے متناقض نزعمل ایک ہی خانہ اعصاب پیدا کر سکتا ہے۔ ماہر اعلم النفس نے اپنے ایک دانشمند طبیب کا ذکر کیا ہے۔ اس کی ایک کم سن لڑکی تھی۔ جسے گدگدی کا غیر معمولی طور پر احساس ہوتا تھا۔ اور وہ گدگدی سے پریشان ہو جاتی تھی۔ آخر طبیب نے لڑکی کو چند مہینوں سے گدگدی کا ایسا تیز اثر پیدا کر دیا۔ کہ وہ گدگدی کو محسوس کئے بغیر برداشت کرنے لگی۔ چند ہی روز میں اس کا جسم ایسا ہو گیا۔ کہ وہ گدگدی کی قطعاً پرواہ نہ ہوتی تھی۔

خلل اور رکاوٹ کے اس نظریہ کی اگر تنویم کے عام قواعد سے تطبیق دی جائے۔ تو اس سے مختلف امور کی وضاحت ہو جائیگی۔ مثلاً نظر اور اگر تنویم طاری کرنے کے طریقہ کو لیجئے۔ اس میں عصب باصرہ پر نہایت تیز اور غیر معمولی تحریک پہنچائی جاتی ہے۔ اور اس کی وساطت سے تحریک کو ایک غیر معمولی تیز عصبی قوت کی صورت میں مرکز بصارت تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس کا اثر صرف اس مرکز تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ ہمسایہ اور متعلقہ مراکز تک تجاوز کر جاتا ہے۔ اعصابی ریشے جو کہ اثرات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے ہیں۔ ان کے وسیلہ سے ان کی جانب نئی تحریک لہروں سے ترکیب پاتی ہے۔ اور ان عصبی راستوں سے گذر کر معمولی تحریکوں سے اس طرح متصل ہوتی ہے۔ کہ خلل پیدا ہو۔ اور ان کی قوت کو سلب کر لے۔ اس طریقہ سے ہم اکثر یا بعض جلدی یا بالائی مراکز کے عمل کی مکمل یا جزوی بجسی تک پہنچ جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی شخص پر تنویم طاری کرنے کے بعد دوبارہ اس پر یہ عمل آسان ہوتا ہے۔ خود توجہی (Auto — Suggestion) اور غیر توجہی (Hetro Suggestion) دونوں صورتوں میں جو طبعی عمل ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ دماغی خیالات کے مرکز سے جو عصبی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ یہ حالت تنویم پیدا کرتی ہے۔ اس لئے بجسی فعل کے بند ہونے کا نہیں بلکہ اس بے نسل اندازی کا نتیجہ ہے۔ اور کسی خاص ---- پیدا اور رفع کیا جا سکتا ہے یہ اس کی شناخت کی بہت بڑی علامت ہے۔ خیال ہے کہ توجہ کے ذریعے ہم اعلیٰ مراکز سے ایک حرکت ---- ان مراکز میں ---- ہیں۔ جن کو ہم اس حرکت سے

منتشر نہیں ہوتے ہیں۔ یہ لہریں ان لہروں سے (جن ان مراکز کے ڈائینامو Dynamo کی تشریح ترکیب سے ظاہر ہوتی ہیں) متصل مراکز کی طاقت کو بڑھاتی ہیں۔ یا ان کے ساتھ متصل امداد ہو کر بعض اثرات پیدا کر دیتی ہیں۔ یہی تنویم کی اساس ہے۔

قلب کی مثال نظام عصبی میں خود اپنے اندر اعتدال پیدا کرنے کی استعداد ہے۔ اور ایک دوسرے پر ان کے باہمی تاثیرات کے درمیان بہت زیادہ تعلق ہے۔ اس کی بہترین مثال قلب ہے۔ اگر ایک سرد خون والے جانور کا قلب جدا کر لیا جائے۔ تو یہ عصبی عقد کی امداد سے باقاعدہ طور پر اپنے انقباضی فعل (سکڑنے کے عمل) کو جاری رکھتا ہے۔ لیکن یہ تمام عقد یکساں عمل نہیں رکھتے۔ ان میں سے اہم عقد تین ہیں۔ یعنی بڈر (Bidder) ریمک (Remak) اور لوڈویگ (Ludwig)

فی الحقیقت یہ تینوں عقد ان ماہرین کی طرف منسوب ہیں۔ جنہوں نے ان کا انکشاف کیا ہے۔ ان میں سے اول الذکر دو عقد محرک مراکز (تحریک کرنے والے) ہیں۔ اور تیسرا رکاوٹ پیدا کرنے کا عمل انجام دیتا ہے۔ تجربہ سے اس کی توضیح ہو جاتی ہے۔ قلب کو کم و بیش دو حصوں میں قطع کیا جائے۔ دائیں حصہ میں 'ریمک' اور بائیں حصہ میں بقیہ دونوں عقد ہوں۔ ان دونوں حصوں میں سے پہلے حصے کی حرکت انقباض و انبساطی جاری رہے گی۔ اور دوسرا بے حرکت و صامت رہیگا۔ اب اگر دوسرے حصے کو دو ٹکڑوں میں قطع کیا جائے تو 'لوڈویگ' والا حصہ بے حرکت رہیگا۔ اور 'بڈر' والا حصہ از سر نو دھڑکنے لگے گا۔ لوڈویگ عقدہ ایک محرک عقدہ کے عمل پر تو غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ مگر دو محرک عقد پر غالب آنے کی طاقت اس میں نہیں ہوتی۔

غالباً تمام حسی اعصاب میں اس امر کی استعداد ہوتی ہے۔ کہ وہ رکاوٹ کا موازنہ کریں۔ اور تنویم کے مطالعہ سے اس نظریہ کی پوری تائید ہوتی ہے۔ اگر دماغ کے چند حسی مراکز یا جسم کے دیگر اعضاء کے ایک مقید حصہ پر یہ عمل کیا جائے۔ تو اعلیٰ ترین مراکز میں رکاوٹ کا اثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کی حیثیت مختلف افراد میں مختلف درجہ کی ہوتی ہے۔ مثلاً پیشانی پر آہستہ آہستہ مالش کرنے سے اکثر افراد میں نیند جیسی اور تنویمی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض اشخاص میں اس حالت کو قبول کرنے کی قابلیت ان کے بعض خاص اعضاء مثلاً سر کی چندیا، ناک، رخسار کی بڈی، عظم ترقوہ (گردن کی ہنسلی) صدر یعنی چھاتی کا حصہ، مرفقی مفصل (کہنی کا جوڑ) ران کے بالائی اندرونی حصے اور گھٹنہ اور تختہ کی بیرونی اور اندرونی سطح تک محدود ہوتی ہے۔ جب ان لوگوں کے جسم کے ان حصوں میں سے کسی ایک پر ہاتھ پھیرا جائے۔ تو جیسا کہ ماہر شارکٹ نے بتایا ہے۔" وہ فوراً تنویم کے پہلے درجہ میں آجاتے ہیں۔"

خوش جیوے سرفراز شاہ وچ مانچسٹر

Published by
FREE AMLIYAAT BOOKS ..PDF